دُھوئیں کی دیوار

طارق اسمٰعیل ساگر

عرضِ مصنف

بہت عرصہ پہلے میں نے ایک ناول ''سموک سکرین'' کے نام سے لکھا تھا، جواب قریباً نایاب ہے۔ طویل مدت کے بعد میں نے اس ناول کو کچھ ترامیم اور اضافے کے ساتھ ''دھوئیں کی دیوار'' بنا کر آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ ممکن ہے یہ کوئی ادبی شہ پارہ نہ ہو۔ یہ تو اللہ کی تخلیق کردہ خوبصورت دنیا کے چند مکروہ انسانوں کی کہانی ہے۔ زندگی کے کڑوے کسیلے سچ سے فرار کے لئے لوگ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان جُو دھوئیں کی چادر تان دیتے ہیں اس کے ہٹنے کے بعد کا منظر بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔

اپنی مرضی کی سچائیاں ڈھونڈنے والے مہم جوؤں کو اکثر ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے کہ زندگی کے گورکھ دھندے کو جتنا سلجھانے کی کوشش کی جائے اتنا ہی الجھتا چلا جاتا ہے۔

سو، اے مہربان لوگو! کیا یہ بہتر نہیں کہ اسے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

میری یہ کتاب ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز سے شائع ہو رہی ہے جس کے بعد امید ہے کہ آپ کی وہ شکایات جو آپ میری کتابوں کیلئے استعمال ہونے والے کاغذ، جز بندی اور پروف ریڈنگ سے متعلق کیا کرتے ہیں جس طرح ہر قاری کی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب معنوی ہی نہیں، صوری طور پر بھی خوبصورت دکھائی دے۔ مصنف بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق جب پیکر میں ڈھلے تو اتنی ہی خوبصورت دکھائی دے جیسا کہ اس نے سوچا اور لکھا۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے حکومت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ قاری اور کتاب کا رشتہ ختم ہو جائے اس کیلئے بہترین ہتھیار کاغذ کی گرانی ہے جسے ہر حکومت نے کلہاڑے کی طرح استعمال کیا ہے۔ دنیا کے جاہل ترین معاشروں میں بھی کتاب کیلئے استعمال ہونے والے کاغذ پر حکومتیں رعایت دیتی ہیں ہمارے ہاں الٹی گنگا بہتی ہے اور زمانے بھر کے ٹیکس کاغذ پر تھوپ کر اُسے اتنا مہنگا اور نایاب کر دیا جاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ان حالات میں جو پبلشرز کتاب خوبصورت انداز میں آپ تک پہنچاتے ہیں، بلاشبہ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز بھی ان میں شامل ہے۔ میری تمام پرانی کتابیں اسی ادارے سے ملیں گی اور جلد ہی انشاءاللہ نئی کتابیں بھی۔

آپ سے درخواست ہے کہ میری کتابیں طلب کرتے ہوئے ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز کا نام ضرور دیکھ لیا کریں تا کہ آپ تک معیاری کتاب پہنچے۔

طارق اسماعیل ساگر

میرا تعلق ایک دیہاتی گھرانے سے ہے۔ میرا باپ ایک سرکاری محکمہ میں سپلائی انچارج تھا اس کام کے متعلق کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے کسی محکمے میں رہ کر سپلائی کے مزے لوٹے ہوں۔ میرا والد سال میں جب ایک آدھ ہفتہ چھٹی گزارنے کے لیے گاؤں آتا تو ہماری حویلی کی بیٹھک کی گویا سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھتی تھی۔ ہمارا گھر شہر کے بالکل قریب واقع تھا۔ ہمارے گاؤں کی حیثیت ایک مضافاتی علاقے کی سی تھی۔ یہاں دو تین گھر چھوڑ کر باقی اوسط طبقہ لوگ ہی آباد تھے۔ دن میں یہ لوگ نزدیکی شہر نوکری کے لیے چلے جاتے اور شام ڈھلے واپس لوٹ آتے۔

عہدے کے لحاظ سے میرے والد بھی ایک کلرک ہی تھے کلرک کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے۔ بمشکل اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے۔ لیکن ہمارے شہر میں دو مکان تھے اور ہمارے گھر کا سامان آرائش و زیبائش کسی آفیسر کے گھر سے بہرحال بہتر تھا۔ یہ سب کچھ کیوں تھا مجھے اس کا ایک ہی سبب نظر آتا تھا وہی سبب جو میرا والد اکثر چھٹی کے دنوں میں اپنی بیٹھک میں بیٹھے گدھوں کے سامنے بڑے فخر سے بیان کرتا تھا اور وہ تھا ''ہذا من فضل ربی''۔

وہ حرام کی کمائی کو بھی ''فضل ربی'' سمجھتا تھا۔ میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے والد کو دولت سے کھیلتے دیکھا۔ ہمارے محلے کے سارے ہی بڑے بوڑھے والد صاحب کے گرویدہ تھے کیونکہ میرے والد کے چھٹی پر گھر آتے ہی ہمارے گھر میں دعوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا اور ساری ساری رات تاش کی محفلیں جما کرتی تھیں۔

نشے میں دھت میرے والد کے دوست رات بھر ہنگامہ برپا رکھتے جب کہ ہماری ماں ہمیں مکان کے آخری کمرے میں اس طرح چھپالیا کرتی تھی جیسے بسا اوقات مرغی چیل کے خوف سے اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپالیا کرتی ہے۔

جب والد اور اس کی دوستوں کی بیہودگیاں اپنے عروج پر ہوتیں تو ہماری ماں جانے قرآن پاک کی کون کون سی آیات پڑھ کر ہم پر پھونکنے لگتی۔

شاید اس طرح اس کے خیال میں ہم اپنے والد کے پھیلائے ہوئے شر سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ پہلے پہل تو ایسا ہو بھی جاتا تھا لیکن اب میں کم از کم بچہ نہیں رہا تھا میری عمر اٹھارہ سال ہو چکی تھی اور زمانے کے گرم و سرد کو اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ میرے لاشعور میں والد کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کا زہر اب آہستہ آہستہ میرے شعور میں بھی پھیلنے لگا تھا اور مجھے اپنے باپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ شدید نفرت!

ہماری ماں..... وہ تو بس اللہ میاں کی گائے تھی۔

دن بھر گدھوں کی طرح کام کاج کرنا اور رات بھر عبادت، نجانے وہ سوتی کس وقت تھی؟ میں نے اس کو زندگی میں ان دو کاموں کے علاوہ تیسرا کام کرتے نہیں دیکھا۔

شاید تیسرا کام یہی تھا کہ وہ میرے والد سے بلاوجہ بے رحمی سے پٹتی رہے اور اف نہ کرے یہ سلسلہ جانے کب سے جاری تھا کیونکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا میرے والد نے کبھی اس فریضے کی ادائیگی میں ناغہ نہیں کیا تھا۔

والد کی نوکری عموماً کسی دوسرے شہر میں رہتی۔ مہینوں ہمیں اس کی شکل دکھائی نہیں دیا کرتی تھی لیکن جب کبھی وہ گھر آتا کسی نہ کسی بہانے میری ماں کو وحشیوں کی طرح پیٹنے لگتا۔ میری ماں کے علاوہ اب مجھے بھی اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ میرے والد نے کوئی اور شادی بھی رچا رکھی ہے۔ یہ بات گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر تھی اس میں حقیقت کیا تھی۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ جو فطرت میرے باپ نے پائی ہے اس قماش کے لوگ عورت کو کسی مقدس رشتے کے حوالے سے کبھی نہیں اپناتے ان کے نزدیک عورت کا ایک ہی استعمال ہوتا

ہے۔ وہ جو کوئی بھی عورت تھی: میرے باپ کی داشتہ ہو سکتی تھی۔ بیوی نہیں۔

بسا اوقات مجھے اپنی ماں پر اتنا شدید غصہ آتا کہ بیان سے باہر ہے میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھوں ایسی عورت کا گلا گھونٹ دوں جو ہر وقت بزدلوں کی طرح مار کھاتی رہتی ہے۔

.....☆☆☆.....

شاید اس نے خاوند سے مار کھانے کو بھی عبادت سمجھ رکھا تھا کیا مجال جو اس اللہ کی بندی کے منہ سے کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی نکلا ہو۔ والد سے مار کھانے کے بعد وہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی۔ میں جب کبھی رات کو اٹھ کر اس کو دبانے کے لیے جاتا وہ زبردستی مجھے واپس بھیج دیتی اور ایسا ہی ظاہر کرتی جیسے اسے کچھ نہیں ہوا۔

میں والد کے گھر سے واپس جاتے ہی اس کو بے تحاشا گالیاں دینا شروع کر دیتا اور یہ میرے لیے ضروری بھی تھا ورنہ میرے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے خلاف نفرت کا آتش فشاں میرے اندر کھول رہا تھا۔ اس دہکتے لاوے کو نکاس کی راہ بھی تو ڈھونڈنی تھی۔ لیکن میری ماں الٹا مجھے ڈانٹنے لگتی بسا اوقات تو میرے منہ پر ایک آدھ تھپڑ بھی جڑ دیتی۔ یہ الگ بات کہ اس کے بعد وہ گھنٹوں ہم سے چوری چھپے کسی کمرے کے کونے میں اپنا سر ہنوڑے روتی رہتی۔

"ایسے ہی موقعوں پر میرے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی، "اللہ ہماری ماں مر جائے۔"

میں سمجھتا تھا کہ اس کی موت سے بہتر اس کے لیے اور کوئی دعا نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک موت ہی تھی جو اس کی زندگی کے دکھوں سے اس کو چھٹکارا دلا سکتی تھی لیکن خدا نے جس طرح میرے باپ کی موت کے متعلق میری دعا کبھی قبول نہ کی، اس طرح میری ماں کے متعلق بھی میری بددعا کو شرف قبولیت نہ بخشا۔ والد کے متعلق تو بات سمجھ میں آ جاتی تھی کہ ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے اس لیے ابھی اللہ تعالیٰ اس کو زندہ رکھنا چاہتا تھا، لیکن ماں کے متعلق اس وقت میرے ذہن میں یہ بات کبھی نہیں آئی تھی، کہ اسے زندہ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا کام لینا ہے؟..... شاید قدرت نے اس کا ابھی اور امتحان لینا تھا تاکہ اس کے درجات اور بلند ہوتے جائیں۔

میرے مجھ سے دو چھوٹے بہن بھائی تھے۔ مجھ سے چھوٹی بہن اور ایک بھائی ہماری

عمروں میں بمشکل ایک یا دو سال کا ہی فرق تھا۔ زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی کہ اچانک ایک روز مجھے نجانے کیا ہو گیا۔

.....☆☆☆.....

اس روز بھی میرا والد حسب معمول ایک ہفتے کی چھٹی گزارنے آیا تھا اور ہمارے ہاں محفلیں جمنے لگی تھیں۔ اس مرتبہ شاید اس نے کوئی لمبا ہاتھ مارا تھا اور شہر کی مشہور طوائف کا مجرہ ہو رہا تھا۔ ساری رات ہو ہاؤ کا ہنگامہ جاری رہا اور ہماری ماں حسب سابق ہم سب کو ایک محفوظ گوشے میں لے کر بیٹھی رہی۔

آدھی رات کے بعد شاید ہنگامہ فرو ہوا۔ کیونکہ آج ہماری ماں کی پڑھی ہوئی کوئی بھی آیت ہمیں نیند لانے سے قاصر رہی تھی۔

اگلے روز میرا باپ نشے میں دھت دن چڑھے تک سوتا رہا اور بیدار ہوتے ہی ماں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

''جنت! جنت! کہاں مر گئی۔''

میری ماں کا نام تو جنت بی بی تھا یہ الگ بات کہ میرے باپ نے اس کی زندگی جہنم بنا ڈالی تھی۔

''کیا حکم ہے سرتاج.....''

میری ماں نے حسب معمول وہ فقرہ دہرایا جسے سن کر میرا خون کھولنے لگتا تھا۔

''کہاں مر گئی ہو گھنٹے بھر سے آوازیں دے رہا ہوں''

اس نے میری ماں کو گالیاں بکنی شروع کر دیں معلوم ہوتا تھا کہ شراب کا نشہ ابھی نہیں اترا تھا۔

''دیکھئے اب بیٹی جوان ہو گئی ہے اور اس کے سامنے اس طرح گالیاں دینا زیب نہیں دیتا۔ بچوں کو بھی سمجھ آتی جا رہی ہے اور آپ کی غلط حرکتیں ان کا ذہن بگاڑ رہی ہیں۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ میری ماں نے نجانے کیسے میرے باپ سے ایک مکمل فقرہ کہہ

دیا۔ شاید یہ ماں کی پہلی اور آخری بغاوت تھی جو اس نے میرے باپ کے خلاف کی تھی۔ والد کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کبھی جنت بی بی اس کو گھر میں اس کے کرتوتوں سے پیدا ہو رہے جہنم کے متعلق کچھ بتائے گی۔

غصے نے اس کا دماغ خراب کر دیا۔ اس نے اپنے قریب رکھی ہاکی سے میری ماں کو بیدردی سے پیٹنا شروع کر دیا میں قریب کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے برسوں ہی کالج میں داخلہ لیا تھا اور آج کل مستقبل کے متعلق ہر وقت سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا۔ آج نجانے مجھے کیا ہوا باپ کے خلاف نفرت کا کھولتا آتش فشاں اچانک پھٹ پڑا۔

.....☆☆☆.....

بے تحاشا خرافات بکتے ہوئے میں نے صحن میں پڑی اینٹ اٹھائی اور پورے زور سے باپ کے سر پر ماری لیکن اینٹ بجائے اس کے سر پر لگنے کے کندھے پر لگی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے نفرت اور غصے سے کھولتے ہوئے میری سمت دیکھا۔ شاید وہ میری اس حرکت کو کوئی معنی نہ پہنا سکا اور والدہ کو چھوڑ کر مجھ پر پل پڑا، لیکن ابھی اس نے مجھ پر چند ہی وار کیے تھے کہ میری ماں ڈھال بن کر مجھ پر گر پڑی۔ میرے باپ نے اسے غصے سے پکڑ کر ایک طرف پھینکا۔

''ذلیل عورت! پہلے تو اسے میرے خلاف کیا اور اب اداکاری کر رہی ہے۔''

نجانے میری ماں کا سر سامنے کس چیز سے ٹکرایا کہ وہ پھر دوبارہ نہ اٹھ سکی۔

مجھے ہوش آیا تو میرے سر پر پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر رکھ رہی تھی۔ خود اس کے سر پر ایک خون آلود پٹی بندھی تھی میرا والد حسب سابق اپنا کام دکھا کر جا چکا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ماں اور چھوٹے بہن بھائی کی چیخ و پکار سن کر ہمارے ہمسایوں نے ہماری جان چھڑائی تھی۔ ورنہ تو آج میرا باپ غصے سے بے قابو ہو کر ہم دونوں کو جان سے ہی مار ڈالتا۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ماں رونے لگی۔ اس کے اندر تو جیسے آنسوؤں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ میرے لیے اس سے اذیت ناک اور کوئی بات نہیں تھی کہ میری ماں رونے لگے میں نے اٹھنا چاہا لیکن چکر آ گیا۔ قریباً سارے جسم پر چوٹیں لگی تھیں۔ وجود ایک دکھتا ہوا پھوڑا بن گیا تھا۔

ماں نے مجھے گلے لگالیا۔ وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رو رہی تھی سرہانے کھڑے میرے دونوں بہن بھائی اور ہمسائے کی چند عورتیں اس طرح رو رہی تھیں جیسے ہم میں سے کوئی مر گیا ہو!

اللہ بھلا کرے ہمارے ہمسایوں کا جو میری ماں کی پوجا کرتے تھے کیونکہ محلے کی تقریباً ساری ہی لڑکیوں کو اس نے قرآن پاک پڑھایا تھا۔ وہ ہماری خدمت میں جت گئے۔ ہمارے ہمسائے کی ایک عورت ہمارے گھر میں چلی آئی اس نے ہماری دیکھ بھال کی یا پھر ہماری بہن تھی عمر تو اس کی بمشکل پندرہ سال ہی تھی، لیکن حالات نے اس کو مکمل عورت بنا دیا تھا اس نے میری والدہ کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا اور جلد ہی ہم دونوں صحت یاب ہو گئے۔

.....☆☆☆.....

ہمارا والد ہمیشہ اچانک آتا تھا اور اچانک ہی اس کی روانگی ہوتی تھی والدہ نے میری صحت یابی کے دوسرے ہی روز مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں آتے ہی اس سے معافی مانگوں گا، ورنہ وہ مجھے دھاریں نہیں بخشے گی۔

کتنی عظیم تھی میری ماں!

!!اس نے نجانے کتنے روگ اپنے اندر ہی اندر پال رکھے تھے۔ میں اب واضح طور پر اس کے اندر ہونے والے شکست و ریخت کے عمل کو محسوس کرنے لگا تھا اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس کے منہ سے درد کی شدت سے کراہ نکل جاتی، لیکن کیا مجال جو اس خدا کی بندی نے کبھی ہمیں اس کا احساس بھی ہونے دیا ہو۔

میں نے ہزار کوشش کر ڈالی کہ اسے ڈاکٹر کو دکھا آؤں لیکن اس نے تو جیسے قسم کھالی تھی کہ وہ اندر ہی اندر گھٹ کر مر جائے گی لیکن اپنا دکھ کسی کو نہیں بتائے گی۔ بس درد کی وہ روایتی سی گولیاں تھیں جو میں اسے کھلا دیا کرتا۔

والد عموماً پانچ چھ ماہ بعد گھر کا ایک آدھ چکر ضرور لگایا کرتا تھا۔ اس کی ایک خوبی کا ذکر کرنا بہر حال ضروری ہے کہ اس کی طرف سے ہمیں ہر ماہ باقاعدگی سے کچھ مل جایا کرتا کیونکہ اس کی تنخواہ اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

لیکن آج اسے گئے ہوئے چھ ماہ ہونے کو آئے تھے نہ تو اس کی طرف سے کوئی منی آرڈر موصول ہوا تھا اور نہ اس کے گھر آنے کی کوئی اطلاع ملی تھی۔ یہ چھ ماہ ہمارے لیے بڑے سکھ

اور آرام کے تھے۔

لیکن میری ماں نے جس طرح یہ عرصہ گزارا اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کا بیٹا اور وہ اپنے خاوند سے معافی مانگیں۔

چھ ماہ گزرے پھر ایک سال بھی گزر گیا لیکن والد کی کوئی خبر نہ آئی۔

اس دوران والد کو لکھے گئے خط کا جواب بھی موصول نہ ہوا۔ اب تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ آخر ایک روز ہمیں قریبی گاؤں کے ایک اور آدمی کا خط موصول ہوا جو اتفاق سے والد کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے لکھا تھا کہ اس کے متعلق ہرگز کسی کو نہ بتلایا جائے کیونکہ ہمارے والد نے ان لوگوں کو سختی سے گھر اطلاع دینے سے منع کر رکھا تھا۔

.....☆☆☆.....

اس شخص نے ہمیں مطلع کیا کہ میرا باپ گرفتار ہو چکا ہے اس نے آج تک جتنی ہیرا پھیری کی تھی اس کا انکشاف ہو گیا ہے اور انٹیلی جنس نے ایک بڑے گروہ کا سراغ لگا لیا تھا جو ایک دوسرے کی ملی بھگت سے ایک طویل عرصے سے بے ایمانی اور ہیرا پھیری کی وارداتیں کر رہے تھے۔ مجھے تو ہر وقت اس بات کی توقع رہتی تھی کہ ایک نہ ایک روز یہ ہو کر رہے گا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی ہے لیکن میری ماں کے لیے یہ خبر بڑی اندوہناک تھی یہ بم میری ماں کی کچلی ہوئی روح اور کرچی کرچی بدن پر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ پھٹا اس روز پہلی مرتبہ میری ماں کو دل کا دورہ پڑا۔

ایک لمحے کے لیے تو سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن میں نے اپنی حالت کو سنبھالا اور بھاگ کر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ تین گھنٹے بعد میری ماں کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ ڈاکٹر نے ہم سے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی بیماری کی ابتدا ہے اور اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

میری ماں ساری زندگی مجھے نماز پڑھنے کی تلقین کرتی رہی لیکن میں نے کبھی اس کی بات پر کان نہ دھرے۔ میں سوچا کرتا تھا جب اس کی بے شمار نمازیں اور تہجد گزاریاں اس کو میرے باپ کے ظلم سے نجات نہیں دلا سکیں تو میرے کس کام آئیں گی، لیکن اس روز ایک طویل

مدت کے بعد پہلی مرتبہ جب میں نے نماز پڑھی تو مجھے احساس ہوا کہ میری سوچ کتنی فرسودہ اور غلط تھی۔ میں جانے رات کتنی دیر تک خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا رہا۔ میں نے ایک ہی دعا مانگی تھی اپنی ماں کے زندہ رہنے کی دعا۔

مجھے تعجب ہوا کہ آج میں اس کے زندہ رہنے کی دعائیں کیوں مانگ رہا ہوں جب کہ اس کی نجات تو مر جانے میں تھی۔ لیکن اس روز مجھے احساس ہوا کہ وہ تو ہمارا سائبان تھی اس کے نیچے تو ہم سب نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس نے ہمیں وقت کی آندھیوں اور جھکڑوں سے محفوظ کر رکھا تھا۔

اگر یہ سائبان ہی گر گیا تو ہم کہاں جائیں گے؟

ہمارے لیے آخر دوسری پناہ گاہ اور تھی بھی کون سی؟

کہاں برگد کی وہ ٹھنڈی چھایا ملتی جو زندگی کی کڑی دھوپ سے ہمیں امان دلاتی۔ تب مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری ماں کے متعلق میری بددعا کیوں قبول نہیں کی۔ وہ میرے والد کی بیوی ہی نہیں تھی، ہماری ماں بھی تھی.....

دھرتی کی طرح وشال ماں۔ جو ہمارے لیے ڈھال بن گئی جس نے ہمیں اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔

والد کی گرفتاری کے حادثے کو ماں کے بعد اگر کسی نے سب سے زیادہ سنجیدگی سے محسوس کیا تو وہ میں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اب میری ذمے داری کیا ہے کچھ بھی ہو آخر وہ ہمارا باپ تھا۔ ہمارا نگران، ہمارے چھوٹے سے کنبے کا سردار، ہم اس کی پہچان تھے اسے زندہ رہنا چاہیے اس لیے بھی کہ اس کی زندگی سے ہی ہماری ماں کی زندگی وابستہ تھی، ہزار ظالم ہونے کے باوجود ایک مسلمان عورت کا شوہر تھا۔ جس نے اپنے وجود کی تمام تر سچائی کے ساتھ اس کو تسلیم کیا تھا اور وہ اپنا یہ حق اور کسی کو سونپنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔

مجھے ایک طویل جدوجہد کرنی تھی اپنے گھر کو بچانا تھا، اپنی ماں کو، اپنے والد کو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بھائی اور بہن کو زمانے کی خونی گرفت سے محفوظ رکھنا تھا۔

یہ لڑائی مجھ اکیلے کو لڑنا تھی۔ والد نے جو سلوک ہمارے رشتہ داروں کے ساتھ آج تک روا رکھا تھا اس کے بعد کسی رشتہ دار سے تعاون یا بھلائی کی امید رکھنا، احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات تھی۔

.....☆☆☆.....

امی کا تعلق اچھے خاندان سے تھا۔ لیکن میری پیدائش کے بعد ہی سے ان کے خاندان نے امی کو والد سے علیحدگی اختیار کرنے کے مشورے دینے شروع کر دیئے تھے۔ انہیں یہی خوف دامن گیر تھا کہ کسی روز میری ماں پٹتے پٹتے مر جائے گی۔ لیکن میری ماں شاید اس زمین کی مخلوق تھی ہی نہیں۔ اس نے تو زندگی خدا اور پھر مجازی خدا کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ مر جاتا تو گوارہ کر سکتی تھی لیکن والد سے علیحدگی کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔

یہی وہ خیالات تھے جن کے ساتھ میں ڈسٹرکٹ جیل کی طرف اپنے والد سے ملاقات کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے اپنی ماں کو ساتھ لانا مناسب نہ سمجھا میں چاہتا تھا کہ پہلے حالات کا صحیح جائزہ لے لوں اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا مناسب تھا۔

عملی زندگی میں اس نوعیت کے کسی واقعے سے پالا پڑنے کا تصور بھی میرے لیے محال تھا۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں سے پیدا ہوا کہ میں ایک دوسرے ضلع کی جیل کی طرف اکیلا چل دیا۔ میں نے اس سے پہلے جیل کا صرف نام ہی سنا تھا اور اس کے متعلق جو خوف میرے لاشعور میں چھپا تھا اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا تھا۔

میں نے سوچا پہلے کسی طرح جیل سپرنٹنڈنٹ سے مل کر اسے سارے واقعات سنا دوں۔ ممکن ہے اس کا دل پگھل جائے اور وہ مدد پر آمادہ ہو جائے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ واقعی ایک شریف انسان تھا۔ اس نے میری تمام گفتگو سننے کے بعد والد صاحب کے ساتھ اپنے کمرے ہی میں میری ملاقات کا بندوبست کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی ''چکر حوالدار'' کی معیت میں میں نے اپنے والد کو اس طرف آتے دیکھا۔

لیکن یہ کیا؟

اف میرے خدایا! میں نے زندگی میں کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ میرے والد کی شکل اس طرح کی بھی ہو سکتی ہے میرے سامنے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ کھڑا تھا جس کے منہ پر بے ترتیب ڈاڑھی اگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی لالی کو آنکھوں کے گرد بنے سیاہ حلقوں نے گویا نگل لیا تھا لیکن ماتھے پر مسلسل عبادت سے بن جانے والی محراب نے نور کا ہالہ سا وہاں ضرور بنا رکھا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر ہم دونوں پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ میں اپنے بدلے ہوئے والد اور میرا باپ اپنے اصلی بیٹے کو پہچان رہے تھے پھر اس نے اچانک آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے سینے سے لگنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے وسوسے، دکھ درد اس سینے کی آغوش میں سما گئے ہوں۔ ہم دونوں خاموش تھے نہ میں کچھ کہہ سکا نہ میرا باپ۔

اس کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو دیکھ کر ایک لمحے کو میرا دل تڑپا ضرور تھا لیکن اس کی آنکھوں کا صحیح حسن میں نے آج ہی محسوس کیا تھا۔

قریباً ڈیڑھ دو منٹ تک ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر روتے رہے۔ پھر میرے باپ نے ہی پہلے اپنی حالت کو سنبھالا۔

''بیٹے! میرے پاس تمہیں کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں ہے میں نے تو فیصلہ کیا تھا کہ اپنے جرم کی سزا میں اکیلا ہی بھگتوں گا۔ کیونکہ اب میں تمہیں اور تمہاری والدہ کو منہ دکھانے کے قابل ہرگز نہیں رہا۔ لیکن قدرت ابھی اپنا انتقام مکمل نہیں کر پائی۔ میں نے رو رو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی ہے لیکن ابھی شاید در توبہ وا نہیں ہوا دعائیں مستجاب نہیں ہوئیں۔

بیٹے! تم صرف ایک بات ہی جان لو میں نے بیس سال تک تمہاری ماں پر وہ ظلم نہیں کیے جتنا ذہنی عذاب پچھلے چند ماہ میں میں نے بھگتا ہے۔ میں جن اذیت ناک لمحوں سے گزر رہا ہوں ان سے موت بدرجہا بہتر ہے بیٹا۔ لیکن نجانے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

ان کی آواز بھرا گئی۔

میرا والد آج جس زبان میں گفتگو کر رہا تھا وہ آج سے پہلے میرے لیے اجنبی تھی کیونکہ

میں نے اسے شعلے اگلتے ہی دیکھا تھا چند لمحے خاموش رہ کر وہ فضاؤں میں نجانے کیا گھورتا رہا۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ میں بھی کچھ بولوں۔ میں کیا کہتا میری تو زبان ہی گنگ ہو چکی تھی میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

یہ بہت بڑا المیہ ہے بسا اوقات ہم بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں اور کچھ نہیں کہہ پاتے۔ میں تو ابھی تک اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرا مخاطب میرا باپ ہے یا کوئی اور؟

شاید والد نے میری اس نفسیاتی کشمکش کو محسوس کر لیا تھا کیونکہ میرے کچھ نہ بولنے پر دوبارہ اس نے کہا۔

''بیٹے زندگی نے آج میرے سامنے اس تلخ حقیقت کو لا کھڑا کیا ہے جس سے میں اب تک آنکھیں چراتا رہا ہوں۔ شراب و شباب اور بے ایمانی سے کمائی ہوئی دولت نے مجھے بالکل بے حس کر دیا تھا۔ کاش! میں نے زندگی میں کسی بھی مرحلے پر تم سے وہ سلوک کیا ہوتا جو ایک باپ کو اپنی اولاد سے کرنا چاہیے تو آج مجھے تمہارے سامنے اس طرح شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔''

والد کی اس بات نے مجھے تڑپا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ہم سے کبھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن بہر حال وہ میرا باپ تھا۔

''خدا کے لیے ایسی باتیں مت کیجئے۔.....''

میں صرف اتنا ہی کہہ پایا، پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میرے والد کو میری جذباتی کیفیت کا احساس ہو گیا تھا اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور ایک مرتبہ پھر ہم دونوں رو پڑے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ جو ایک رحم دل انسان بھی تھا یہ سارا ڈرامہ دیکھتا رہا اس نے ہم دونوں کو الگ الگ کر کے ہمارا حوصلہ بڑھایا اور ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔ کافی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔

والدہ نے دم رخصت والد کے لیے بہت کچھ میرے ہمراہ کر دیا تھا وہ میں نے انہیں سونپا تو والد بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

میں حیران ہو رہا تھا اور ماضی اور حال کے اپنے باپ کا موازنہ کر رہا تھا۔

جیل سے رخصت ہوتے وقت میرے ذہن میں میرے والد کے وہ الفاظ مسلسل گونج رہے تھے جو اس نے اذیت اور کرب کے نجانے کتنے لمحوں سے گزر کر مجھ تک پہنچائے تھے۔

''بیٹا تمہاری ماں کو ہر حالت میں زندہ رہنا چاہیے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کہ میں اس سے اپنے گناہوں کی معافی نہ مانگ لوں۔ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں شاید اس لیے بھی زندہ نہ رہ سکوں کہ اب میرا ضمیر بیدار ہو چکا ہے!!''

کتنی سچی بات کہہ دی تھی میرے باپ نے اور میں نے بھی اپنے شعور کی تمام تر گہرائی کے ساتھ اس سچ کو قبول کر لیا۔ پھر گھر پہنچا تو ماں کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ میں نے کالج کی تعلیم کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اب سارے گھر کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی تھی۔

میرے باپ پر کتنا سنگین جرم عاید کیا گیا تھا اور اس کے خلاف کیسی ٹھوس شہادتیں اکٹھی کی گئی تھیں اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ مجھے اس بات کا بھی علم ہو چکا تھا کہ اس قسم کے مقدمات میں روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے اگر روپیہ خرچ کرنے میں ذرا سی بھی کنجوسی دکھائی گئی تو جیل میں میرے والد کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟ کیونکہ وہ جیل والوں کے لیے بہر حال ایک مجرم تھا جس کے گھناؤنے جرائم کی فہرست بڑی طویل تھی ٹھیک ہے جیل سپرنٹنڈنٹ خدا ترس انسان تھا۔ لیکن اس جیل میں اس کے علاوہ بھی بیسیوں لوگ کام کرتے تھے اور ان کے لیے میری کہانی میں دلچسپی کی اگر کوئی بات تھی تو صرف اتنی کہ میں اپنے والد کو اچھی جیل کٹانے کے عوض ان کے منہ میں کیا ڈال سکتا ہوں؟

مقدمے کا خرچ تو ایک طرف فی الوقت تو مجھے اپنے باپ کی صحت کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ان کی جو جسمانی حالت میں نے دیکھی تھی اس کے بعد ان کی صحت کی طرف سے آنکھیں بند کرنا ناممکن تھا۔

سب سے پہلے میں نے ان کے علاج معالجے کا بندوبست کرنا تھا اور اس کے لیے جیل کے چھوٹے عملے کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

اس ''اعتماد'' کی قیمت کیا تھی۔ اس کا اندازہ میں لگا سکتا تھا۔

گھر والوں کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا۔ وہ سب والد کے متعلق جاننا چاہتے تھے۔ان کے مستقبل کی فکر دامن گیر تھی سب کو،اب وہ صرف اور صرف ہمارے والد صاحب تھے اور کچھ نہیں۔کتنا عجیب ہوتا ہے خون کا رشتہ۔ایک ہی لمحے میں ہم سب نے پچھلے کئی برسوں کے واقعات بھلا دیئے تھے۔

میں نے سب کو تسلی دی اور انہیں یقین دلایا کہ اب کوئی طاقت ہمارے ''ابو'' کو ہم سے جدا نہیں کر سکے گی۔میرے لہجے میں چھپے عزم کی گہرائی کو انہوں نے محسوس کیا،قبول بھی کر لیا اور مطمئن ہو رہے۔

.....☆☆☆.....

اس رات میری ماں نے حسب معمول عشاء کے بعد جب مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکیں ماریں تو ان کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک کر میرے ماتھے پر آن گرا۔میں نے اس نمی میں چھپے درد کو محسوس کر لیا تھا لیکن آنکھیں کھول کر انہیں کچھ نہ کہا۔کہتا بھی کیا؟ اگلے روز علی الصباح میں نے شہر میں موجود اپنے ایک مکان کے کرائے دار کا رخ کیا یہ شخص عدالت میں کام کرتا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ اس دنیا کے اسرار و رموز سے مجھے زیادہ بہتر طریقے سے آگاہ کر سکے گا۔اس کے علاوہ میرے ساتھ تعاون بھی کرے گا۔کیونکہ اس کا رابطہ میرے والد سے بہت کم اور ہم سے زیادہ رہتا تھا۔

اس نے بڑے تحمل سے میری رام کہانی سنی۔اس کے خاتمے پر ایک طویل سانس لے کر سب سے پہلے اس نے مجھے متعلقہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے ''تبادلے'' کی خبر سنائی تاکہ میرے ذہن میں اگر کوئی غلط فہمی ابھی باقی ہے تو وہ دور ہو جائے پھر مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا جیل کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے اور اپنے قوانین وہاں پر ہر اچھا برا ہے اور ہر برا اچھا۔جرم کسی نے کیوں کیا؟ یہ سوچنا جیل والوں کا کام تو ہوتا نہیں۔وہ تو ہر آنے والے کو بلا تمیز ایک ہی کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں تب انانیت اور عزت نفس کو بچانے کا ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ ملزم انہیں دولت کے پہیے سے باندھ کر گھماتا رہتا ہے ورنہ تو وہ ان کے نزدیک انسان نہیں

جانور بن کر رہ جاتا ہے۔''

میرے لیے گو کہ یہ نئی معلومات نہیں تھیں پھر بھی اپنے اس کرائے دار کے ذریعے مجھے وہ شخص میسر آ گیا جو میرے اور اس جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے درمیان ''رابطہ'' بن سکتا تھا، جہاں میرے والد حوالاتی بنے اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔

اس ''رابطے'' کو ہمارے کرائے دار نے خاص طور پر ''ہاتھ ہلکا رکھنے'' کی نصیحت کی تھی۔پھر بھی مجھے ایک بھینس جیل کے ڈپٹی صاحب کے آبائی گھر پہنچانی پڑی اس نسخہ کیمیا نے میرے والد کے جیل کی زندگی کے بہت سے مسائل حل کر دیئے۔

.....☆☆☆.....

میں نے اپنے شہر کے چوٹی کے وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور مقدمہ حسب روایت مکڑی کی چال چلنا شروع ہو گیا۔قدم قدم پر پیسے کی ضرورت تھی پولیس، وکلاء، عدالت، جیل، گھر کی بیماری کس کس کا مقابلہ کرتا سرکاری فیسوں کی ادائیگی تک بات رہتی تو بھی شاید بات بن جاتی لیکن یہاں تو ہر کوئی منہ کھولے بیٹھا تھا اور مجھے سب کے منہ بند کرنے تھے۔یہی ایک راستہ تھا والد کو بچانے کا یوں بھی میرے والد بے گناہ تو نہیں تھے اس دنیا میں تو بے گناہوں کو اپنی صفائی کے لیے اپنے گھر فروخت کرنے پڑتے ہیں۔جب معاملہ یکسر مختلف ہو تو ویسے بھی ہر بات کے ریٹ ڈبل ہو جاتے ہیں۔

جیل سے جو گاردوالد کو تاریخ بھگتانے لاتی تھی اس کے الگ تھلے الگ تھے وکیلوں کی تو فیس تھی لیکن منشی اپنی فیس الگ وصول کرتے تھے۔عدالتی اہلکاروں کا نذرانہ اس کے سوا تھا۔

ایک ایک کر کے ہمارے شہر والے دونوں مکان گروی ہو گئے۔جس روز عدالت عالیہ نے ہماری حالت پر بے حد رحم کھاتے ہوئے میرے والد کو پانچ سال قید بامشقت کا حکم سنایا اس روز میری والدہ کے میری بہن کے لیے جمع کیے ہوئے تمام زیورات بھی اونے پونے داموں فروخت ہو چکے تھے اور لے دے کے ہمارے پاس وہ مکان رہ گیا تھا جس میں ہم مقیم تھے۔

میں نے بمشکل کورٹ فیس جمع کی اور ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔دوسرے ہی روز میں

نوکری کی تلاش میں نکل گیا کیونکہ اب ذریعہ آمدن اور کوئی رہا ہی نہیں تھا جمع پونجی تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ نوکری اگر محنتی تعلیم یافتہ اور صحت مند ہونے کی وجہ سے مل جانے والی کسی چیز کا نام ہوتا تو میں فوراً اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جاتا میں بیس سال کا ایک مضبوط اور واقعی خوبصورت نوجوان تھا۔ میری تعلیمی قابلیت کا اندازہ اس طرح فرمالیجئے کہ میں نے دو سال تک والد کا مقدمہ لڑنے کے باوجود اپنی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے پر بھی پرائیویٹ امتحان کے ذریعے بی اے میں بہترین پوزیشن حاصل کی تھی۔

ان دنوں ''کیریکٹر سرٹیفکیٹ'' وغیرہ پیش کرنے کا رواج بھی گو کہ زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود میرے پاس سکول کالج کی تعریفی اسناد کی مکمل فائل موجود تھی اور میری شرافت کی گواہی میرے علاقے کا ہر معزز شخص دے سکتا تھا، لیکن والد کی گرفتاری اور فراڈ کے مقدمے میں اخبارات نے ان کی شہرت خاصی بڑھا دی تھی۔ والد کو سزا ہونے تک اخبارات کے کرائم رپورٹرز ہماری جان کو آئے رہے۔

میں زندگی بھر صحافت کے اس انداز کو نہ سمجھ سکا جب ایک اخبار کے فوٹو گرافر نے تاریخ پیشی پر ملاقات کو آئی میری ماں اور بہن کی تصاویر بھی اتار لیں اور اگلے روز یہ تصاویر ''فراڈ کے ملزم کی بیوی اور بیٹی'' کے کیپشن کے ساتھ شائع ہو گئیں۔

''خدایا یہ دن دیکھنا بھی ہمارا مقدر تھا'' اس روز شاید زندگی میں پہلی مرتبہ میری ماں نے خدا سے گلہ کیا تھا۔

جہاں بھی میں نے نوکری کے لیے درخواست گزاری مجھے ''فراڈ کے ملزم کا بیٹا ہونے'' کی فوراً سزا ملی اور نوکری سے نکال دیا گیا۔

ہمارے شہر میں ایک مشہور کنسٹرکشن کمپنی کا دفتر تھا کسی نے وہاں جانے کا مشورہ دیا میں پہلے ہی درخواستوں اور انٹرویو سے خاصا تنگ آیا ہوا تھا سوچا کیوں نہ سب کچھ پہلے ہی ان لوگوں کے علم میں لے آؤں جو انہوں نے انٹرویو پر مجھ سے پوچھنا ہے ممکن ہے یہ بھی جیل سپرنٹنڈنٹ کی طرح کوئی خدا ترس انسان ہوں اگر معاملہ ایسا نہ بھی ہوا تو کم از کم انٹرویو کے جھنجھٹ سے تو جان

چھوٹ جائے گی۔ یہی کچھ سوچ کر میں نے کمپنی کے ڈائریکٹر کو تفصیل سے ایک خط لکھ کر اپنے تمام حالات سے آگاہ کر دیا اور یہی میری وہ غلطی تھی جس کا خمیازہ میں آج تک بھگت رہا ہوں۔

میں نے اپنی وانست میں اپنے تمام حالات سچ سچ لکھنے کے بعد اس نے نوکری کی التجا اس لیے کی تھی کہ اس طرح اس میں جذبہ ہمدردی پیدا کر سکوں گا جب کہ مجھ جیسے نوجوانوں کی ضرورت اسے ہمیشہ رہتی تھی۔ تین دن تک میں بڑی بے چینی سے جواب کا منتظر رہا چوتھے روز جواب موصول ہوا، مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تب میں نے سوچا کہ میری ماں کی دعائیں مستجاب ہو گئی ہیں۔

انٹرویو میں عموماً جو سوالات پوچھے جاتے ہیں وہ تعلیم تجربہ کے متعلق ہی ہوا کرتے ہیں، لیکن وہ تو مجھ سے کچھ اور پوچھ رہا تھا اور پوچھنے کا انداز اس قدر ہمدردانہ اور شریفانہ تھا کہ اس پر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میری زبانی میرے تمام حالات سے متعلق کرید کرید کر مختلف سوالات پوچھے پھر ازراہ کرم مجھے اپنی فرم میں بطور کلرک تعیناتی سے نواز دیا کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق میں متعلقہ جاب کے اہل نہیں تھا۔

میرا سابقہ تجربہ صفر تھا اور اس ''جاب'' کے لیے کم از کم پانچ سالہ تجربہ درکار تھا۔ پھر میرے والد کی شہرت کے بعد یوں بھی کوئی شریف آدمی مجھے منہ لگانے کو تیار نہیں تھا۔ گو کہ دنیا کے کسی مذہب یا ضابطہ اخلاق یا قانون کی رو سے کسی گناہ گار کے گناہوں کی سزا اس کی اولاد کو نہیں ملتی لیکن یہ دستور زمانہ تھا اور مجھے بہرحال اس کا سامنا کرنا تھا، میں نے ان کی مہربانی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ ہمیشہ اس کا بھی اور فرم کا بھی تابعدار رہوں گا۔

آخر کو میرا تعلق اس ملک اور معاشرے سے تھا۔ جہاں بھائی اور باپ اگر جرم کریں تو پولیس سب سے پہلے گھر کی بہو، بیٹیوں کو تھانوں میں لے جا کر رسوا کرتی ہیں۔ جہاں ''گلیمر'' اور تحیر پیدا کرنے کے لیے ملزم کی بیٹی اور بیوی کی تصاویر بھی حاشیے لگا کر شائع کر دی جاتی ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرشتوں نے بھی شاید کبھی ان حوا زادیوں کو ننگے سر نہیں دیکھا۔

اس فرم میں ملازمت کرتے ہوئے مجھے دو ماہ کا عرصہ ہو چلا تھا۔ کام تو کوئی خاص ہوتا

نہیں تھا لیکن تنخواہ ہر ماہ باقاعدگی سے مل جاتی تھی۔ اس کے علاوہ باس کبھی کبھی خاص طور پر میری خیریت دریافت کر لیا کرتا۔ میں نے اپنے دونوں بہن بھائیوں کو اسی طرح رکھا جس طرح میرے والد کے ہوتے وہ رہتے تھے۔

میری بہن سال دوم میں پڑھتی تھی اور بھائی سال اول کا طالب علم تھا۔ تنخواہ سے بمشکل گھر کا خرچ ہی چل رہا تھا۔ والد کے مقدمے کی پیروی کے لیے مجھے بہر حال دولت چاہیے تھی۔ دوسری طرف ماں کی بیماری خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ وہ میرے لاکھ بضد ہونے پر بھی بڑی مشکل سے ڈاکٹر کے کلینک تک جاتی۔ کیونکہ ہر مرتبہ ڈاکٹر سو ڈیڑھ سو روپے کی دوائیاں لکھ کر پرچی ہمارے ہاتھ میں تھما دیتا اور میری ماں کو اس تلخ حقیقت کا شدت سے احساس تھا کہ اس کے بیٹے کی کمائی تو اس کے علاج کے لیے ہی کم ہے باقی روگ کون پالے گا۔

جہاں تک احباب اور رشتے داروں کا تعلق تھا تو ان سے ہمارا شکوہ ہی بے جا تھا کیونکہ میرے والد نے حرام کی کمائی کے گھمنڈ میں ساری عمر کسی کو منہ لگانا ہی پسند نہ کیا۔ خیال سے ان کا سلوک بھی محل نظر تھا۔ پھر میری والدہ سے یہ گناہ بھی تو سرزد ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے گھر والوں کے اصرار کے باوجود والد سے طلاق کا مطالبہ نہ کیا۔ ہمارے معاشرے میں یہ قابل معافی گناہ نہیں ہوتے۔

بڑے ماموں نے تو ہماری طرف دیکھ کر تھوکنا بھی بند کر دیا تھا، جو بے چارے دوسرے رشتہ دار تھے ان سے میری والدہ میرے والد صاحب کے حکم کی سرتابی کرتے ہوئے کبھی کبھار کسی شادی یا مرگ پر کسی نہ کسی بہانے مل لیا کرتی تھی۔ جس کا خمیازہ اس کو بہر حال بعد میں والد سے مار پٹائی کی صورت میں بھگتنا ہی پڑتا تھا۔ باقی رہے والد کے دوست تو وہ جس چیز کے لیے دوستی کا دم بھرتے تھے وہ ہی نہ رہی تو دوستی کیسے رہتی؟

میں نے چھوٹی عمر ہی میں زندگی کے ایسے ایسے تلخ حقائق کا سامنا کر لیا تھا کہ خود کو دوگنی عمر کا جاننے لگا۔ والد کے وہی دوست جو دن رات اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے اس کی گرفتاری کے بعد دن رات اس کو گالیاں دینے لگے۔ ان کو ایک ایک کر کے میرے والد کی تمام

خرابیاں ان کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی نظر آنے لگی تھیں۔ بے چارے ہمدردی کے دو بول ادا کرنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ بس ہمارے لٹنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

بھاگ دوڑ کر کسی نہ کسی طرح میں نے ہائی کورٹ سے مقدمے کی تاریخ نکلوالی، اور اب وہی عدالتوں کے چکر تھے اور میں کسی اچھے وکیل کی تلاش میں سرگرداں۔

.....☆☆☆.....

ایک روز ابھی دفتر سے گھر واپس ہی آیا تھا کہ مجھے عجیب وغریب شخصیت سے واسطہ پڑا۔ یہ حضرت پچھلے دو گھنٹے سے میرا انتظار کر رہے تھے اور اس کی وجہ بقول ان کے یہی تھی کہ میرا ان سے ملنا از حد ضروری تھا۔

ڈھلتی عمر، گنجا سر، سیاہی مائل گندمی رنگ اور آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک، پرانی وضع قطع کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے، پہلی نظر میں تو وہ کوئی شریف آدمی ہی دکھائی دیتے تھے۔ لیکن انہوں نے جب اپنا تعارف کروایا تو مجھے سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ میرے اندازے ان کے متعلق بالکل غلط ثابت ہوئے تھے۔ موصوف کا تعلق متعلقہ عدالت سے تھا جس میں ہمارا مقدمہ زیر سماعت تھا اور بقول ان کے وہ مجھ سے صرف انسانی ہمدردی کا جذبہ۔ لے کر ملنے آئے تھے۔ ''ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا بیٹا! کہ دوسرے کے معاملات سلجھاتے پھریں۔ نہ ہی آج کل کا زمانہ ایسا ہے کہ کسی کے ساتھ نیکی کی جائے۔ میاں یہاں تو نیکی برباد گناہ لازم ٹھہرتا ہے۔ تم گذشتہ دو تین ماہ سے عدالت کے چکر کاٹ رہے ہو اور خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہو اس لیے تم سے ملنے چلا آیا..... میری بات غور سے سن لینا اس پر عمل کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے''

انہوں نے اپنے میلے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور ڈبیا واپس اسی جیب میں دیا سلائی سمیت رکھ کر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''برخوردار شریف آدمی ہو، عدالتوں کے چکروں ہی میں والد کی سزا کے دن پورے کر دو

گے۔ فلاں وکیل کر لو وہ جج صاحب کے خاص آدمی ہیں، اگر مقدمہ بری نہ ہوا تو کم از کم سزا میں کافی کمی ہو جائے گی اور صرف اتنی ہی سزا باقی رہ جائے گی جتنی انہوں نے کاٹ لی ہے۔''

بالآخر انہوں نے پتے کی بات بھی کہہ دی جس کے لیے انہیں اتنی تمہید باندھنی پڑی تھی۔ ظاہر ہے بزرگوار کسی بڑے وکیل کے ٹاؤٹ تھے اور ان کا تعلق متعلقہ عدالت سے تھا۔ انسان گرنے پر آئے تو کس حد تک گر سکتا ہے اس کا اندازہ شاید کوئی نہیں لگا سکتا۔

جاتے جاتے وہ فلاں وکیل صاحب کی فیس بھی سنا گئے تھے۔ دس ہزار روپے صرف اور یہ بھی کہہ گئے کہ اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد ہرگز نہیں تھا۔ بس ایک خدا خوفی تھی یا پھر میری حالت زار اور شرافت جس سے متاثر ہو کر وہ میری مدد کو چلے آئے تھے۔

ممکن ہے یہ کچھ ان کے بزنس کا حصہ بھی رہا ہو لیکن اس بات کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ تو چائے بھی مجھ سے نہیں پی رہے تھے۔ بس میں نے زبردستی پلا دی۔

انگریز کے عنایت کردہ فرسودہ اور ظالمانہ عدالتی نظام نے مجھے میری بے بسی کا احساس کافی پہلے ہی دلا دیا تھا۔ اس لیے مجھے اس حقیقت کو قبول کرنا ہی پڑا کہ واقعی دس ہزار روپے ہوں تو میرے والد جلدی گھر آ سکتے ہیں۔

ورنہ پانچ سال قید انہیں بہرحال کاٹنی پڑے گی۔ جبکہ دو سال پچھلے مقدمے کی کارروائی کے نذر ہو گئے تھے۔ مجھے اپنی ماں کی صحت دیکھ کر اس بات کا بخوبی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اتنا لمبا عرصہ زندہ نہیں رہ سکے گی اور اپنے والد سے کیا ہوا عہد بہرصورت نبھانا تھا۔ یہ زندگی کا پہلا شریفانہ معاہدہ تھا جو ہم دونوں باپ بیٹے کے درمیان طے پایا۔ مجھے اپنی ماں کی زندگی کے لیے اپنے باپ کو رہا کروانا تھا۔ جس کے لیے دس ہزار روپے ضروری تھے۔ لیکن یہ دس ہزار آخر آئیں گے کہاں سے.....؟

یہی ایک سوال رہ رہ کر مجھے ڈس رہا تھا۔ اب تو گھر میں بکنے والی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ سب کچھ تو بک چکا تھا۔

''کیوں نہ اپنے باس سے قرضہ کی درخواست کروں۔''

میں نے سوچا آخر اتنی بڑی فرم ہے اور وہ لوگ اپنے ملازموں کو قرضہ بھی دیا ہی کرتے ہیں۔ پھر باس تو مجھ پر پہلے ہی خاصا مہربان ہے ورنہ اسے کیا پڑی ہے کہ خاص طور پر مجھ ہی سے خیریت دریافت کرتا پھرے۔

.....☆☆☆.....

مجھے امید تھی کہ وہ مجھے خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹائے گا اور مجھے دس ہزار روپیہ جو اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن جو میرے لیے فی الوقت زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے، ضرور دیدے گا.....! ساری رات میں یہی کچھ سوچتا رہا اور اگلے روز بڑا ہی پرامید اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ ذہن میں ایک خوبصورت اور شاندار مستقبل کا سپنا سجائے۔

میں تصور کر رہا تھا کہ اس وقت کا جب میرے والد اپنے نئے روپ کے ساتھ گھر واپس لوٹتے.....میری ماں کے لیے وہ کتنا نصیبوں والا دن ہوگا۔ میں نے سوچا اور سوچتا ہی رہا۔

سیٹھ صاحب نے بڑے اطمینان سے میری گفتگو سنی وہ میری ہر بات کے جواب میں ہاں ہاں کرتے رہے جس سے مجھے یہی امید بندھی کہ خدا نے میری سن لی۔

انہوں نے مجھے کہا کہ اصولی طور پر وہ مجھے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتے کیونکہ ابھی مجھے ان کی فرم میں ملازم ہوئے اتنا عرصہ نہیں گزرا کہ میں کسی قرضے کا مستحق ٹھہروں۔ پھر چونکہ ان کی فرم لمیٹڈ ہے اس لیے وہ اپنی مرضی سے کچھ کر بھی نہیں سکتے۔

''قانونی معاملہ ہے مجھے تمہارا کیس بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں رکھنا ہوگا۔ کیونکہ حتمی فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس پوزیشن میں نہیں کہ تمہاری مدد کر سکوں۔''

انہوں نے سگار کے دھویں کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال تو کچھ کہنا ممکن نہیں۔ کم از کم ایک مہینہ انتظار کرنا ہوگا۔''

''لیکن سر! مجھے تو آج اور ابھی ضرورت ہے۔''

میں نے قریباً گھگھیاتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو بھئی ایک صورت ہے تم قرض کے وبال سے بھی بچ جاؤ گے۔ اور پیسے بھی مل جائیں گے۔''

انہوں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

''وہ کیسے؟''

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہم تمہیں ہر طرح کے تحفظ کا یقین دلاتے ہیں تم پر کوئی آنچ بھی نہیں آئے گی۔ پھر کام بھی کوئی مشکل نہیں۔ پڑھے لکھے ہو، نوجوان ہو، مضبوط جسم کے مالک ہو، ہمیں کام کروانے کے لیے ہزاروں گدھے مل سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ مجھے تم سے ہمدردی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہارا بھلا ہو جائے تو اچھا ہے؟

میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ سیٹھ کی اس بات کا مطلب مجھے سمجھ نہ آتا۔ پچھلے دو سال سے میں نے جرائم کی اس گھناؤنی دنیا کے ایسے ایسے اسرار جان لیے تھے کہ اب مجھے کم از کم اس حوالے سے کی جانے والی ہر بات کی فوراً سمجھ آجاتی تھی۔ ظاہر ہے سیٹھ نے مجھے یونہی نوکری نہیں دی تھی۔

یہ بڑے گھاگ شکاری تھے۔ پھندہ لگا کر مچان میں بیٹھ کر لمبے عرصے تک ٹھنڈے پیٹوں شکار کا انتظار کرتے تھے۔

یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک مرتبہ ان کے جال میں پھنسنے کے بعد پھر کوئی بچ کر نکل جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بہت پہلے مطلب کی بات پر آجاتا لیکن میں نے کہا ناں کہ یہ کاروباری لوگ حملہ ہی اس وقت کرتے ہیں جب شکار کے چاروں شانے چت ہو کر گر پڑنے میں کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔ اس دوران بڑے تحمل سے سیٹھ میرے حالات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اب اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ شکار بچ کر نہیں جا سکتا۔ میں اس کے پھندے میں آگیا تھا۔ فرار کی تمام راہیں مسدود تھیں۔

.....☆☆☆.....

کرنا کیا ہے؟

کام کی قانونی نوعیت کیا ہوگی؟

میری زندگی پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

مجھے اب ان سب باتوں سے کوئی غرض نہیں رہی تھی۔ حالات نے مجھے زندگی کے اس چوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں چاروں اطراف کو ایک ہی طرح کے راستے پھوٹتے تھے۔ مجھے بہرحال یہی راہ اپنانی تھی۔ سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں آنکھیں بند کر کے تباہی کی ان گہری کھائیوں میں تن بہ تقدیر کود جاؤں کہ سلامتی کی یہی راہ میرے لیے باقی تھی۔ اپنے ناموس اور ماں باپ کی زندگی بچانے کے لیے میں نے جس شخص کے سامنے دامن پھیلایا مجھ سے زیادہ میرے وجود کا صحیح استعمال اسے معلوم تھا اور مجھے قسمت نے پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ وہ کفران نعمت کا گنہگار کیوں ہوتا۔

جلد ہی سیٹھ مطلب کی بات پر آ گیا۔ اس نے بغیر لگی لپٹی رکھے مجھے اشاروں کنایوں سے میرے کام کی نوعیت سمجھا دی۔ یہ بھی صرف اتمام حجت کے لیے تھا تاکہ میرے پاس اس کے بعد اگر فرار کا کوئی اخلاقی جواز بھی موجود ہے تو وہ ختم ہو جائے۔

اپنی دانست میں وہ مجھ سے کھلا سودا کر رہا تھا۔ مجھے دھوکے میں رکھ کر میرا مول نہیں چکایا تھا اس نے۔

جس بازار کا وہ سوداگر تھا وہاں اپنے ہم سفر سے کھوٹ کا سودا نہیں کیا جاتا وہ تو ''اس ہاتھ دو اور اس ہاتھ لو'' کی دنیا ہے۔

جس سفر پر میں گامزن ہونے جا رہا تھا اس کی اونچ نیچ کا ذکر بین السطور ہی میں سہی۔ بہرحال میرے سامنے کرنا ضروری تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

میرے ہاں کہنے پر اس نے دس ہزار کا چیک کاٹ کر مجھے تھما دیا اور ساتھ ہی ایک رقعہ ایک خاتون کے نام لکھ دیا۔

''آج اطمینان سے اپنا کام کروا بھی بنک بند نہیں ہوئے۔ چیک کیش کروا لو اپنے کام

سے فراغت کے بعد کل یا پرسوں اس ایڈریس پر چلے جانا.....''

مجھے نظروں ہی نظروں میں تولتے ہوئے اس نے فتح مندانہ مسکراہٹ میری طرف اچھالی۔ بڑا کایاں آدمی تھا۔ میٹھی چھری جس کی کاٹ کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ کٹنے کا عمل مکمل نہ ہو جائے۔ رقعہ اس نے ایک لفافے میں بند کر کے لفافہ مجھے تھما دیا۔

میں نے بند لفافے پر لکھے ایڈریس پر سرسری سی نظر بھی نہیں ڈالی۔ مجھے اس سے غرض بھی کیا تھی۔ آخر کو اس نے میرے دام چکائے تھے۔ اب اس کی مرضی پر منحصر تھا کہ مجھے آگے کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دے یا پھر اپنے استعمال کے لیے رکھ چھوڑے۔

چیک وصول کرتے وقت مسکرایا میں بھی تھا لیکن ہارے ہوئے جرنیل کی طرح جس نے اپنی شکست کے بلیک وارنٹ پر محض اس لیے دستخط کر دیے ہوں کہ اس کے بچے کھچے سپاہی شاید اس طرح زندہ بچ جائیں۔

میں سیدھا اپنے بزعم خویش محسن و بزرگوار کے بتائے ہوئے وکیل صاحب کے دفتر پہنچا۔ عدالتی کاغذوں کا پلندہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ وکیل صاحب نے فائل پر لکھے میرے والد کے نام پر نظریں دوڑاتے ہوئے بتیسی نکال دی۔ اور مجھ سے گویا ہوئے۔

''قاضی صاحب! نے آپ کی سفارش کی تھی۔ میرے پاس تو بہت رش ہوتا ہے لیکن میں قاضی صاحب کو ''نہ'' نہیں کہہ سکتا۔''

یہ وہی قاضی صاحب تھے جو شہر کا درد اپنے دل میں سمائے میرے گھر تشریف لائے تھے۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے چپ رہا صرف شکریہ کہا اور اسے ایڈوانس فیس تھما کر مقدمے کا بوجھ ذہن سے اتار کر واپس گھر چلا آیا۔

.....☆☆☆.....

سیٹھ سے رخصت ہوتے وقت میں نے وہ لفافہ لے کر جیب میں ڈال لیا تھا لیکن گھر آ کر جب میں نے اس پر لکھے ہوئے ایڈریس کو غور سے دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غلطی سے میرا ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو، یہ ایڈریس شہر کی مشہور سوشل ورکر مسز نادرہ کا تھا۔

مسز نادرہ کسی بھی اخبار پڑھنے والے کے لیے اجنبی نام نہیں تھا۔ ملکی اخبارات کے کسی نہ کسی صفحے پر کسی نہ کسی حوالے سے ان کی تصاویر اور بیانات آئے روز دیکھنے اور پڑھنے کو مل جایا کرتے تھے۔ کہیں کسی فری ڈسپنسری کا افتتاح، کبھی کسی یتیم خانے کی امداد کے لیے ہونے والے کسی جلسے کی صدارت، اور کہیں کسی خیراتی ادارے میں تقریر کرتی وہ اکثر نظر آیا کرتی تھیں۔ شہر کی کئی اصلاحی سوسائٹیوں کی وہ عہدیدار تھیں۔

جوانی ہی میں ان کو بیوگی کے صدمے سے دو چار ہونا پڑا اور اس کے بعد سے انہوں نے ''سماجی بہبود'' کو ہی مقصد زندگی قرار دے رکھا تھا۔ ان کی شخصیت کے متعلق عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں عام لوگوں کے نزدیک وہ ایک ''دیوی'' کا درجہ رکھتی تھیں۔

ہر مہینے ہزاروں روپے ملک کے مختلف یتیم خانوں کو وہ چندہ دیا کرتی تھیں۔

ان کا شباب، ان کی بے پناہ امارت اور اس پر ان کی سماجی خدمات لوگوں کے نزدیک ان کا مرتبہ اتنا بلند کیسے نہ ہوتا؟ لیکن مسز نادرہ کا یہ روپ بھی ہوگا میری تو کیا مجال تھی۔ ملک کا کوئی شہری یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا جی میں کئی مرتبہ آئی کہ میں لفافہ کھول کر دیکھ لوں آخر اس میں کیا لکھا ہے لیکن ہمت نہ پڑی۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ صورت حال وہ نہ ہوتی جس کا اندازہ میں نے لگا رکھا تھا۔ یا کہیں ایسا نہ ہو کہ لفافہ کھول کر میں دوبارہ اسی طرح بند نہ کر سکوں اور سیٹھ کی ناراضگی خواہ مخواہ مول لے لوں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات اس خط میں لکھی تھی تو یہ بڑے بیوقوف لوگ تھے۔

آخر یہ خط کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتا ہے۔ یوں بھی ایسی باتیں تو یہ لوگ اشارے کنائے میں یا پھر فون پر کیا کرتے ہیں۔ آن دی ریکارڈ نہیں لایا کرتے۔

''ضرور سیٹھ نے میرا امتحان لیا ہے۔''

میں نے سوچا۔

وہ رات میں نے کانٹوں کی سیج پر کروٹیں بدل بدل کر کاٹی۔ خدا خدا کر کے سورج نے سیاہ گھور اندھیروں سے منہ نکالا اور مجھے ایک لمبے کرب سے نجات ملی۔

علی الصباح میں مسز نادرہ کی کوٹھی کی طرف عازم سفر تھا۔ عجیب عجیب خیالات کے بھنور ذہن میں بنتے اور بگڑتے رہے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی ڈوبتا ابھرتا رہا۔ تجسس.....

بے پناہ تجسس کے ہاتھوں کئی دفعہ جی چاہا کہ اس لفافے کو کھولوں تو سہی۔ ذہن نے لفافہ کھول کر بند کرنے کے کئی بھولے سبق یاد دلائے۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔

مسز نادرہ کا قیام شہر کی جس بستی میں تھا وہاں زندگی صبح نو بجے کے بعد ہی بمشکل بیدار ہونا شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی صبح عموماً دوپہر کو ہوتی ہے اور رات کے متعلق بھی وہ کچھ ایسے ہی نظریات رکھتے ہیں۔ میں جب مختلف ویگنوں میں دھکے کھانے کے بعد وہاں پہنچا تو صبح کے بمشکل نو بجے تھے۔

مسز نادرہ کی کوٹھی اسی شاندار آبادی کے ایک کونے میں واقع تھی اور اس لائن میں بنی ہوئی باقی کوٹھیاں اس کے سامنے جھونپڑی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے اتنی شاندار عمارت کسی انگریزی فلم میں بھی نہیں دیکھی تھی۔

کوٹھی کے گیٹ پر بنے ایک حفاظتی برج میں ایک پٹھان چوکیدار کھڑا مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''بھاگ جاؤ.....''

جیسے اس نے مجھے آنے والے عذاب کی بشارت دی۔

اس کا لہجہ بڑا خونخوار تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا اگر دوبارہ میں نے اس سے کوئی بات کی تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔ اچانک ایک ترکیب مجھے سوجھی۔ میں نے جیب سے وہی لفافہ نکالا جو مسز نادرہ کے نام تھا اور اس سے کہا۔

''انہوں نے خود مجھے نو بجے بلایا ہے یقین نہ ہو تو یہ لفافہ لے جا کر ان کو دکھا دو۔ دوسری صورت میں اپنی نوکری سے ہاتھ دھو رکھو.....''

میں نے اسے وارننگ دی۔

چند لمحوں کے لیے اس نے کچھ سوچا غالباً میری بات کے آخری حصے پر غور کر رہا تھا۔ پھر یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور اس کے چہرے کی دہشت آہستہ آہستہ کم پڑنے لگی۔ جلد ہی وہ نارمل ہو گیا۔

''اچھا تم یہیں ٹھہرو''

اس نے لفافہ میرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

''زیادہ چالاکی نہ دکھانا ورنہ کتا تمہیں پھاڑ کھائے گا''

اس نے جاتے جاتے مجھے تنبیہ کی اور میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ چوکیدار کی واپسی قریباً تین چار منٹ کے بعد ہوئی تھی اس اثنا میں، میں ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے حجری دور کا کوئی جنگلی پہلی مرتبہ مہذب دنیا میں آیا ہو۔

چوکیدار کی واپسی ایک باوردی ملازم کے ساتھ ہوئی۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ اندر لے گیا۔ کوٹھی کے گیٹ سے ڈرائنگ روم تک کا سفر میرے لیے طلسم ہوشربا سے کم نہیں تھا۔ وہ سب کچھ جو میں اس سے پہلے سینما سکرین پر دیکھا کرتا میرے سامنے تھا۔ ملازم مجھے بڑے احترام سے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کسی کو اطلاع دینے چلا گیا۔

.....☆☆☆.....

ڈرائنگ روم کیا تھا، راجہ اندر کا دربار.....

اس سے زیادہ نفیس اور آرام دہ کمرہ بھی روئے زمین پر اور کوئی رہا ہو گا؟ اس وقت ذہن نے اس کا جواب نفی میں دیا تھا۔ آرٹ کے وہ شاندار نمونے جو صرف عجائب گھروں میں رکھے جاتے ہیں، یہاں بھی موجود تھے۔

بڑی بڑی قد آدم تصویریں نرم و گداز صوفے، بیش قیمت قالین جن پر رکھے پاؤں زمین میں دھنستے جاتے تھے۔ اس پر مستزاد ایئر کنڈیشن ماحول.....

میں حیرت سے ابھی اس ماحول کا نظارہ ہی کر رہا تھا جب دروازے پر آہٹ ہوئی اور

ایک سبک خرام دوشیزہ ٹرالی دھکیلتی اندر آ گئی۔

اس کے سلام کرنے کا انداز ملازموں والا اور میرے لیے حادثے سے کم نہیں تھا۔ خدایا! ایسی اپسرائیں کسی کی خادمہ بھی ہوتی ہیں۔

میں اچانک ایسے اٹھا تھا جیسے صوفے کے سپرنگوں نے مجھے فضا میں اچھال دیا ہو۔ میرا خیال تھا کہ یہ مسز نادرہ کی کوئی رشتہ دار ہو گی۔ لیکن وہ تو ان کی معمولی سی نوکرانی تھی۔ مجھے یوں بوکھلائے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تشریف رکھئے۔''

اس نے بڑی شائستگی سے مجھے مخاطب کیا۔

میں کسی سحر زدہ ''معمول'' کی طرح دوبارہ صوفے میں دھنس گیا اس نے بڑے ناز و انداز سے جھک کر مشروب بنایا اور میری خدمت میں پیش کر دیا۔

مشروب بنانے والے کا کمال تھا یا پھر اس ماحول کی کرم فرمائی جس میں مجھے وہ مشروب پیش کیا گیا کہ میں نے زندگی میں اس سے پہلے اتنا لذیذ پھلوں کا جوس کبھی نہ پیا تھا۔

جتنی دیر میں جوس پیتا رہا وہ کمرے کے ایک کونے میں باادب کھڑی رہی۔ گلاس میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا اور مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر اور کھڑی رہی تو میں اٹھنے کے قابل بھی نہ رہ جاؤں گا۔ میں نے اپنی حالت کو سنبھالا، گلاس خالی کر کے خود ہی ٹرالی پر رکھ دیا۔

خود کو سنبھالا دینے کے لیے میں اس کی دعوت دینے والی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے ایک کونے میں لگی پینٹنگ پر نظریں جما کر بیٹھ رہا۔

''اور پیش کروں سر؟''

اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر جھکتے ہوئے پوچھا۔

''نو''.....(NO)

میں نے پورے وقار سے جواب دیا اور میری اس اچانک تبدیل شدہ حالت پر اس

نے مشکل سے ہنسی روکی ہوگی۔

وہ جس طرح قیامت ڈھاتی اندر آئی تھی اس طرح اپنی کمر کو ہزاروں بل دیتی ٹرالی دھکیلتی باہر چلی گئی۔

مجھے خود پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا، کیا بے وقوف لگ رہا ہوں گا۔ میں اس کے سامنے؟ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور خود ہی مسکرا دیا۔

ابھی بمشکل ہی اس حادثے سے سنبھل سکا تھا کہ اچانک اس کی واپسی ہوئی پہلے کی طرح ایک شرارت آمیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ناچ رہی تھی۔

اس دوران میں یہی سوچتا رہا تھا کہ مسز نادرہ نے اتنی خوب صورت اور ماڈرن ملازمہ شاید کسی مغربی ملک سے درآمد کی ہے۔

''آپ کو بیگم صاحب نے یاد فرمایا ہے۔''

اس نے پہلے کی طرح بڑے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''چلو''

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی گھبراہٹ پر میں نے کافی حد تک قابو پا لیا تھا کم از کم ملازمہ کے سامنے حواس باختگی کا مزید مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ میرے آگے آگے چل دی اور میں اس کے تعاقب میں۔ ہم ایک راہ داری سے گزر رہے تھے جس کے دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے اور دیواروں پر اتنا خوبصورت پینٹ کیا گیا تھا کہ نگاہ ہٹائے نہیں ہٹتی تھی۔ ایک کمرے کے سامنے جا کر وہ رک گئی۔

''تشریف لائیے۔''

اس نے کمرے کے دروازے کو کھول کر ایک طرف ہو کر مؤدب لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

میرے اندر قدم رکھتے ہی وہ دروازہ بغیر آواز پیدا کیے بند کر کے باہر چلی گئی۔ یہ مسز نادرہ کی خواب گاہ تھی.....

مجھے یوں لگا جیسے میں غلطی سے ہالی وڈ کی کسی ایکٹریس کے کمرے میں گھس آیا ہوں۔

مسز نادرہ سلیپنگ گاؤن پہنے ایک کھڑکی سے باغ کا نظارہ کر رہی تھی جیسے ہی دروازہ بند ہوا اچانک میری طرف گھومی اور میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

اس کی عمر تو چالیس سال کے اوپر تھی لیکن شاید وہ ملک کی خوبصورت ترین عورت تھی۔ میں نے اخبارات میں سرسری نظر سے اس کی تصویر دیکھی تھی۔ لیکن وہ اتنی حسین ہو گی اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی غلافی آنکھوں نے جیسے مجھ پر مسمریزم کر دیا۔ میرے منہ سے بمشکل ہی ''سلام علیکم'' نکل گیا۔

.....☆☆☆.....

اس نے میرے سلام کا جواب گردن ہلا کر دینے پر اکتفا کرتے ہوئے ہاتھ سے ایک خوبصورت صوفے کی طرف اشارہ کیا جو خواب گاہ کی دیوار سے لگا تھا۔

میں سحر زدہ سا صوفے میں دھنس گیا جس کے آگے ایک خوبصورت اخروٹ کی لکڑی کی بنی میز تھی اور صوفے کے سامنے والی دیوار پر ایسی ہیجان انگیز، تصویر ٹنگی تھی کہ میں پگھل پگھل گیا ایسی تصاویر کا شمار ممکن ہے دنیا کے آرٹ کے بہترین نمونوں میں ہوتا ہو لیکن اس کا مغرب کی کسی خواب گاہ میں تو تصور کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں نہیں.....

سب ایک لمحے کے لیے میرے دل میں یہ بات ضرور آئی کہ مسز نادرہ کی اس خواب گاہ تک اور کتنے لوگوں کی رسائی ممکن ہو گی! اور کیا یہ تصویر یہاں ہمیشہ ٹنگی رہتی ہے بلاشبہ مسز نادرہ نے مجھ پر سنہری زنجیر کی گرفت پہلے ہی ہلے میں مضبوط کر دی تھی اتنی مضبوط کہ پھر کبھی میں اس سے نکل نہ پاؤں۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

اس نے کھڑے کھڑے مجھ سے پوچھا۔

''جی۔ راشد''

میں نے انکساری سے جواب دیا۔

''جی راشد یا صرف راشد۔''

اس نے میری بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ دل ہی دل میں وہ میری حالت زار سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''راشد''

میں نے گویا بات مکمل کر دی۔

میرے صاحب کا دیا ہوا خط اس کے پلنگ کے سرہانے پڑی خوبصورت ٹی پائی پر رکھا تھا۔ ایک دفعہ اور اس نے اٹھا کر اسے پڑھا اور میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''سگریٹ پیو گے؟''

اس نے قریب رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور اس صوفے کے دوسرے کنارے پر براجمان ہو گئی جس میں میں دھنسا بیٹھا تھا۔

''جی یہ میں پیتا نہیں''

میں نے اپنے والے کونے میں مزید سمٹتے ہوئے کہا۔

''سگریٹ نہیں پیتے تو کیا پیتے ہو؟''

اس نے سگریٹ ایک قیمتی سگریٹ لائٹر سے سلگاتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا اور نہ جانے میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔

''فی الحال کچھ نہیں''

یہ میرا قطعاً غیر ارادی فعل تھا۔

''وہ کیوں؟''

اس نے سگریٹ کے چھوڑے ہوئے دھویں کے مرغولے میں سے جھانکتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''جی بس ایسے ہی.....''

میں نے کھسیانے ہو کر کہا۔

''عجیب آدمی ہو ملک نے تو تمہاری بہت تعریف کی ہے۔''

اس نے میرے مالک کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کی ذرہ نوازی ہے۔''

میں نے قدرے سنبھل کر جواب دیا۔

اس اثناء میں مسز درانی کی نظریں بڑی بیباکی سے میرے کسرتی جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شاید ان لوگوں کو ایسے ہی مضبوط جسموں والے گدھوں کی ضرورت رہتی ہے۔

''تعلیم کتنی ہے؟''

اس نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

جی گریجوایشن کر رکھی ہے۔

''گڈ.....''

اس نے میرے گھریلو حالات دریافت کرنے شروع کر دیئے مجھے ایک مرتبہ پھر درجنوں مرتبہ مختلف لوگوں کے سامنے سنائی ہوئی داستان مظلومیت کو دہرانا پڑا۔

مسز درانی اسی درمیان کرید کرید کر مجھ سے مختلف سوالات پوچھتی رہی۔

''چائے پیو گے ناں؟''

اس نے بیڈ کے کونے پر لگی گھنٹی کے پش بٹن کو دبایا۔

''جی''

مجھے اور کوئی جواب نہ بن پڑا دروازہ آہستگی سے کھلا ایک مرتبہ پھر وہی شعلہ جوالا میرے سامنے تھی۔

''چائے''

مسز درانی کے منہ سے نکلا اور وہ انہی قدموں پر واپس گھوم گئی۔

.....☆☆☆.....

چائے مسز درانی نے خود بنائی میرے سامنے دھری میز پر میرے لیے پیالی رکھ دی۔

''جانتے ہو تمہیں کس کام کے لیے بلایا گیا ہے۔''

اس۔نے دوسری پیالی بھی وہیں رکھی اور اچانک ٹہلتے ٹہلتے رک کر میرے بالکل نزدیک ہو کر صوفے پر براجمان ہو گئی۔

مسز درانی کے قرب نے ایک لمحے کے لیے تو مجھے بوکھلا کر ہی رکھ دیا تھا لیکن میں فوراً سنبھل گیا۔

"جی ہاں۔"

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

اب میں نے اس کی شخصیت کے دباؤ سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب مجھے زندگی نے پلاسٹک کی گڑیا بنا کر حالات کے تیز دھارے پر بہا ہی دیا تھا تو پھر اس میں شرمانے یا گھبرانے کی کیا بات رہ گئی تھی۔

"کیا مطلب....."

اس نے پلکیں اٹھاتے ہوئے میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھا اور مجھے ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی اسی پراسرار قوت کا قائل ہونا پڑا جو فولاد کو بھی موم کی طرح پگھلا دینے کی سکت رکھتی تھی۔

"مجھے آخر دس ہزار روپے خدا واسطے تو ملے نہیں"

میں نے آنکھیں جھکائے جھکائے اس سے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں اگر تم چاہو تو واپس لوٹ سکتے ہو میں تو روزانہ ہزاروں روپے یتیموں اور محتاجوں میں بانٹتی رہتی ہوں۔"

اس نے براہ راست میری مردانگی پر چوٹ کی۔ بڑی نبض شناس تھی وہ اس کا پہلا وار ہی اتنا بھرپور تھا کہ میں چاروں شانے چت پڑا۔ بات میری انانیت پر آ پڑی تھی۔

"میڈم! میں آپ لوگوں کے احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا اور آپ کی ایک ایک پائی کا حق ادا کروں گا۔ اتفاق سے میں نہ تو یتیم ہوں نہ ہی محتاج۔"

میرے فقرے کا آخری حصہ خاصا طنزیہ تھا.....

"خاصے جذباتی ہو۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔ اس کی مسکراہٹ نمایاں ہو گئی اور مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہونے لگا۔

"جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے دانت نکال کر بات ٹالنی چاہی۔ وہ پیالی میز سے اٹھانے کے بہانے اب میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔

اتنی نزدیک کہ مجھے اپنے بدن میں خون کے بجائے انگارے تیرتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس نے چائے کا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے دوبارہ معمول کی باتیں کرنے کے بعد مجھے مخاطب کیا۔

"او کے مسٹر راشد! اب تم جن حالات سے گزر چکے ہو یہ تو ظاہر ہے دوبارہ ان سے گزرنا نہیں چاہو گے۔

تم بچے بھی نہیں ہو۔ حالات نے تمہیں بہت کچھ سکھا اور بتلا دیا ہے۔ یہ دنیا تم جیسے مضبوط جسم اور ذہن والوں کے لیے ہمیشہ چیلنج بنی رہی ہے.....اس چیلنج کو قبول کرو اور زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں چھین لو۔ مجھے دیکھو....." اس نے میرے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے میری گردن بالکل اپنی طرف موڑی۔

"اگر تم شہر کے چوراہے میں کھڑے ہو کر لوگوں کو چلا چلا کر بھی یہ بتاؤ کہ میں کوئی غلط عورت ہوں تو وہ تمہاری بات کا ہرگز یقین نہیں کریں گے بلکہ تمہیں پکڑ کر پاگل خانے پہنچا دیں گے۔"

"راشد! کبھی کبھی مجھے اپنے لوگوں کی سادہ لوحی پر رونا آتا ہے لیکن میں کیا کروں..... یہ کمبخت ہیں ہی اسی لائق۔" اچانک اس کا لہجہ بدل گیا۔

"یاد رکھنا تمہارے تصور سے بھی زیادہ لمبے اور مضبوط ہیں ہمارے ہاتھ۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ہم تمہیں کبھی پولیس کی گرفت میں نہیں آنے دیں گے۔ اور مصیبت کے وقت

تمہاری ہر ممکن مدد بھی کریں گے۔لیکن....."

اس نے رک کر دوسرا سگریٹ سلگایا ایک لمبا کش لے کر دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"ہمارا معاہدہ یکطرفہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کے عوض ہم تم سے بھی کچھ چاہیں گے، ہمارے مفادات سے کبھی نہ ٹکرانا بس....."

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس انداز سے کہا کہ واقعی میں سہم کر رہ گیا.....دوبارہ وہ ٹہلتی ہوئی کمرے کی کھڑکی تک گئی وہاں رک کر اس نے سگریٹ کے دو تین کش لگائے اور اس مرتبہ وہ میری طرف گھومی تو بالکل بدلی ہوئی عورت تھی۔ اس کے چہرے کی نرمی جانے کہاں رخصت ہوگئی تھی۔ اس مرتبہ وہ "کالی ماتا" کا روپ دھار کر مجھ سے مخاطب تھی۔

"دوسری صورت میں روزانہ اخبارات میں کسی کے بلڈنگ سے گرنے، دریا میں ڈوبنے یا ایکسیڈنٹ سے مرنے کی خبریں تو آتی ہی رہتی ہیں۔"

اس کی آنکھیں مجھے اپنے چہرے میں دھنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ کیفیت بھی وقتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہی پراسرار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی جو اس کی خوبصورت شخصیت کا اہم ترین حصہ تھی۔

"یہ سب کچھ میں نے تمہیں اس لیے کہہ دیا ہے کہ جس مقام پر تم آج کھڑے ہو۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو آج سے ایک سال بعد یہاں سے بہت اوپر اڑ رہے ہو گے۔ اس وقت ممکن ہے کبھی تمہارا ذہن تمہیں بہکانے کی کوشش کرے تب یہ بات تمہاری راہنما بنے گی۔ اس کاروبار کا اصول یہی ہے کہ ایک آدمی کے لیے سب کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ سب لوگوں کے مرنے سے ایک کا مر جانا بہر حال افضل ہے۔ دو باتوں کا خیال رکھنا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنا اور کبھی ہماری ٹوہ میں نہ رہنا۔ جتنا کہا جائے صرف اتنے ہی پر عمل کرنا۔ زیادہ چالاکی نہیں دکھانا۔ ممکن ہے تم نے یہ راستہ مجبوری کے ہاتھوں اپنایا ہو۔ اگر چاہو تو ابھی واپس لوٹ جاؤ۔ بھول جاؤ کہ تم نے ملک سے دس ہزار قرض لیا ہے یا کبھی نادرہ سے ملے تھے۔"

.....☆☆☆.....

جب مسز نادرہ یہ باتیں کر رہی تھیں تو اس کا چہرہ پرانے زمانے کی کہانیوں والی کسی خوبصورت ڈائن یا آدم خور جادوگرنی جیسا نظر آ رہا تھا۔ لیکن بات ختم کرتے ہی اس کے چہرے کی تمام نحوست رخصت ہوگئی اور اب وہاں وہی مسکراہٹ اور ہمیشہ رہنے والا سکون ہی سکون تھا۔ جو میں نے اخبارات میں دیکھا تھا۔

مجھے دوران گفتگو اپنا جسم پسینے میں بھیگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ ایئر کنڈیشن کی یخ بستہ ہوا نے کمرے سے گرمی کا احساس ختم کر رکھا تھا۔

میرے پاس اس کی بات کا کیا جواب ہوتا۔ اس نے آخری فقرہ خلوص نیت سے کہا تھا یا دکھاوے کے لیے مجھے اس کی سمجھ نہ آ سکی۔ میں نے صرف سر جھکا دیا۔ گویا یہ اطاعت گزار بن جانے کا اعتراف تھا۔ اس فتح کا جشن اس نے کافی منگوا کر منایا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کافی پی۔

جب میں نے مسز نادرہ سے کہا کہ میں کافی نہیں پیتا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پیو آئندہ زندگی میں تمہیں بہت کچھ پینا پڑے گا ابھی سے کڑوی چیزیں پینے کی عادت ڈالو۔ ہمارے پیشے کے لیے بہت ضروری ہے۔"

دوپہر کا وقت ہم نے اکٹھے گزارا اور اس روز کریم کافی پینے کے بعد جب میں اپنے آپ کو پاک صاف رکھ کر وہاں سے باہر آ رہا تھا تو خود کو بڑا بہادر انسان جانتا تھا کہ اتنی خوبصورت ناگن بھی اپنی لاکھ کوشش کے باوجود میرا ایمان نہیں ڈگمگا سکی۔

عجیب احساس تھا یہ بھی۔ تب میں اس احساس کی کوئی توجیہہ بھی نہ کر پایا۔ بس یونہی جانے میں نے ایسا کیوں سوچا تھا؟

.....☆☆☆.....

اس روز مسز درانی کے ہاں سے واپس لوٹتے ہوئے میں نے صرف ایک ہی بات پوچھی تھی۔

"اب رابطے کی کیا صورت ہوگی؟"

"مطمئن رہو..... تمہیں میرا پیغام مل جایا کرے گا۔ تم خود رابطہ نہیں کرو گے۔ ایک بات کا خاص طور سے خیال رکھنا کبھی پبلک پلیس پر اول تو میرے سامنے ہی نہ آنا اگر اتفاقاً ایسا ہو ہی جائے تو یہ خیال بھی دل میں نہ لانا کہ میرا اور تمہارا کوئی تعلق ہے۔ وہاں میری حیثیت وہی ہو گی جو ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اس بات پر سختی سے کاربند رہنا۔"

میں واپس لوٹ آیا۔

تیسرے ہی روز مجھے سیٹھ صاحب نے بیگم نادرہ کے ہاں پیش ہونے کا حکم دے دیا۔ اس مرتبہ چوکیدار نے میری شکل پر نظر پڑتے ہی دروازہ کھول دیا۔ میری ملاقات کے لیے بیگم نادرہ ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔

بیگم صاحبہ نے مجھے شہر کے ایک مشہور جنرل اسٹور پر ایک چٹ دے کر بھیج دیا۔ جس پر صرف لکھا تھا "سامان اسے دے دیں" اور نیچے بڑے عجیب وغریب دستخط تھے۔

بیگم نادرہ نے مجھے سمجھایا تھا کہ آج سے میری نوکری میرے صاحب کی فرم سے ختم۔ اب میں اس کا ملازم ہوں اور کبھی بھولے سے بھی اپنے صاحب کے نزدیک نہیں پھٹک سکتا۔ بلکہ مجھے یہ بھول ہی جانا ہے کہ میں کبھی وہاں ملازمت کرتا رہا ہوں۔ اس نے میری "مردانہ وجاہت"

اور "تعلیم" کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے "حلقہ خاص" میں شامل کرلیا تھا ورنہ اس ملک کی درجنوں کروڑ پتی اس سے چند منٹ گفتگو کرنے کے لیے کئی کئی گھنٹے اس کا انتظار کیا کرتے تھے۔

زادراہ کے لیے مجھے ایک ہزار روپیہ مسز نادرہ نے دیا تھا۔ یہ بھی سمجھایا تھا کہ یہ میرا ٹسٹ کیس ہے۔ اگر میں نے کامیابی سے پاس کرلیا تو زندگی کی تمام آسائشوں کے دروازے مجھ پر کھل جائیں گے۔

اس نے میرے مضبوط بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے سکندر اعظم بن کر ساری دنیا کو اپنے قدموں میں جھکا دینے کی دعوت دی تھی.....

اور میں نے بڑی ہی سعادت مندی سے اس کی یہ دعوت قبول کی تھی۔ میں سکندر بننے چلا تھا۔ شاید میں نے تاریخ مکمل نہیں پڑھی تھی۔

وہ ہمارے شہر کا ایک مشہور جنرل اسٹور تھا۔ جہاں بیگم نادرہ نے مجھے "سکندر اعظم" بنا کر روانہ کیا تھا۔

اس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو کی لپٹیں ابھی تک مشام جان کو معطر کر رہی تھیں۔ میں نے ایک کونے میں بیٹھے بظاہر معزز سے موٹے آدمی کو وہ چٹ دکھائی۔ اس نے بغیر کچھ کہے سنے انٹر کام پر اپنے ملازم کو ہدایات دیں اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

بریف کیس دینے والا میرے ساتھ ہی باہر تک آیا اور اس کی گاڑی میں ہم ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں پہنچے جہاں ایک علیحدہ کیبن میں بیٹھ کر اس نے پرتکلف چائے کا حکم دیا مجھے کچھ ہدایات دیں اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ اس بریف کیس کو سرحدی علاقے کے ایک گاؤں میں پہنچانا ہے۔

یہ سرحدی علاقہ ہمارے شہر سے قریباً ستر میل کی دوری پر تھا لیکن یہ سو میل مجھے سو برس پر محیط نظر آرہے تھے بظاہر فاصلہ ٹرین یا بس کے ذریعے دو ڈھائی گھنٹے میں بخوبی طے ہو جاتا تھا۔

میں نے اس سے مطلوبہ جگہ اور آدمی کے متعلق اچھی طرح جانکاری حاصل کی اور چائے پی کر باہر نکل آیا۔

جب اس سے رخصت ہو کر میں باہر نکلا تو محاورتاً ہی نہیں حقیقتاً حواس باختہ تھا ہر روز کسی نہ کسی سمگلر کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں آتی رہتی تھی اور اس راستے پر سفر کرنے والوں کو کئی مرتبہ تلاشی کے سخت ترین مراحل سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔

اس وقت ایک ہی آواز بار بار میرے اندر سے بلند ہوتی اور میں اس کا گلا دبا دیتا۔

''بھاگ جاؤ.....تم اس دنیا کے لیے پیدا نہیں کیے گئے.....اب بھی وقت ہے اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ.....''

لیکن اب یہ ناممکن تھا۔

کیونکہ اپنی دنیا کی سرحدیں پھلانگ کر میں نے اب جس دنیا میں قدم رکھ دیا تھا اس میں آنے کا راستہ تو تھا۔ واپسی کی راہ میسر نہیں تھی۔

مجھے ان کے ایک اڈے سے باقاعدہ آگاہی حاصل ہو گئی تھی۔ اب میں ان کا ''لائف ممبر'' تھا۔

میری موت ہی اس گروہ سے میری علیحدگی کا باعث بنتی اور ابھی مرنا میں نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے بہرکیف اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جینا تھا۔ جینے کا عزم لے کر میں نے بالآخر ڈرتے جھجکتے کارزار حیات کی اس پرفریب پگڈنڈی پر پاؤں رکھ ہی دیئے۔

سب سے پہلے بریف کیس لے کر میں گھر گیا۔ والدہ کو کچھ پیسے دے کر کہا میں فرم کے کام سے دو تین دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں وہ میرے بعد پریشان نہ ہونا شروع کر دیں۔

اس کے ساتھ ہی اپنی چھوٹی بہن کو ہدایت کی کہ وہ ماں کی صحت کا خصوصی خیال رکھے وقت پر انہیں دوائی ضرور پلا دیا کرے.....

چھوٹے بھائی کو ان دونوں پر نگران مقرر کر کے میں انہیں سپرد خاک کر آیا۔ یہ میرا پہلا باقاعدہ جھوٹ تھا جو میں نے اپنی ماں سے بولا۔ اس وقت جہاں میرا دل اندر ہی اندر خون کے آنسو رو رہا تھا وہاں میں اپنے ضمیر کو اس ڈھکوسلے کی سلیپنگ پلز دے کر اپنی دانست میں مطمئن کر رہا تھا کہ میں یہ سب کچھ اپنی ماں باپ بہن اور بھائی کے لیے کر رہا ہوں۔

مجھے ان کی خوشیاں بہرحال عزیز ہیں اور حالات نے بدقسمتی سے مجھے اس بیڑے کا کپتان بنا دیا ہے۔ جس کے پیندے میں شگاف ہو چکا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اس شگاف کو بند کرنا تھا۔ اس بیڑے کو حالات کے طوفان کی تند و تیز لہروں سے سلامتی کے ساتھ نکال کر لے جانا تھا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت مجھے ادا کرنی پڑے۔

.....☆☆☆.....

اس علاقے کی طرف جانے والی ٹرین کا ٹکٹ میں نے ریلوے سٹیشن سے خرید لیا تھا۔ ایک جاسوسی ناول میں پڑھی ہوئی سمگلنگ کی کہانی میرے لاشعور سے زندہ پیر کی طرح جاگ اٹھی تھی۔ میں نے اسی کہانی کے مطابق تیاری بھی کر لی تھی۔

بازار سے لوہے کا ایک ٹرنک خرید لایا تھا۔ میں نے بریف کیس کو ٹرنک میں کپڑوں کے درمیان رکھا ٹرنک پر ایک فوجی کا نام اور اس کی یونٹ وغیرہ کا نمبر میں نے پہلے ہی کسی رسالے سے پڑھ کر لکھوا لیا تھا۔ میری کنگ فوجیوں والی تھی اور اب میں ایک فوجی کے روپ میں جو اپنی یونٹ سے چھٹی پر گاؤں جا رہا تھا۔ سفر کرنے کے لیے تیار تھا۔ ریلوے سٹیشن پہنچ کر تیسرے درجے کا ایک ٹکٹ خریدا اور ٹرنک کو اپنی برتھ کے اوپر رکھ کر اطمینان سے ساتھ والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

ٹرین کی روانگی سے پہلے ایک سفید کپڑوں میں ملبوس خفیہ پولیس کا آدمی وہاں آیا۔ اس نے سرسری نظر مسافروں پر ڈالی اور باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔ ہمارا ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد ان مزدوروں کی تھی جو اس سرحدی علاقے سے محنت مزدوری کرنے کے لیے شہر آیا کرتے تھے۔

اب تک ان دیکھے خوف نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ جس سے میں اس سفر کا آغاز کرتے وقت دوچار ہوا تھا۔ لیکن اب اس کی شدت میں کمی ضرور واقع ہو چکی تھی۔ اور میں نے بادل نخواستہ ہی سہی ایک طرح حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ شلوار قمیض میں ملبوس میں کھڑکی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔

خوف سے نجات پانے کے لیے میں نے اپنے ہم سفروں سے گفتگو شروع کر دی۔ روانگی سے پہلے مجھے اس شخص نے اس لائن پر آنے والے مختلف دیہات اور ان کی سرکردہ شخصیات کا تعارف بھی فراہم کر دیا تھا تا کہ وقتاً فوقتاً انہیں استعمال میں لا کر سوالات کر سکوں اور اب انہیں سوالوں کا سہارا لے کر مزید معلومات حاصل کر رہا تھا۔

.....☆☆☆.....

گاڑی قریباً ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد ایک سٹیشن پر ٹھہری جہاں سے تین چار پولیس والے ہمارے ڈبے میں چلے آئے۔ مجھے ایک بات کا بخوبی علم تھا کہ بسا اوقات مخبری ہو جاتی ہے اور آدمی قابو آ جاتا ہے اور خفیہ پولیس جو چھاپے مارتی ہے وہ کسی مخبر کی اطلاع ہی پر مارے جاتے ہیں۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا کے مصداق خفیہ پولیس کے ڈبے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے بھی یہی خیال آیا۔

''کہیں خدانخواستہ کسی کو مجھ پر شک ہو گیا ہے.....''

میری یہ پہلی واردات تھی اس لیے لاکھ خود پر کنٹرول کرنے کے باوجود دل میں خواہ مخواہ ہول اٹھ رہے تھے۔ خفیہ پولیس والوں کی نظروں کے ممکنہ ٹکراؤ سے بچنے کے لیے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

نو واردوں نے ڈبے میں موجود لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور برتھوں پر رکھے مختلف ڈبے اور اٹیچی کیس کھول کھول کر دیکھنے لگے اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک فروٹ کی ٹوکری میں سے انیون برآمد کر لی۔ گاڑی کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی شاید یہاں کوئی مرمت کا کام ہو رہا تھا۔

''کس کی ٹوکری ہے یہ؟''

ان میں سے ایک بولا۔

میں تو اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔

قریب تھا کہ میری اڑی ہوئی رنگت مجھے مروا دے۔ شاید قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا۔ میرے سامنے بیٹھے مسافروں میں سے ایک اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور قریباً بھاگتا ہوا ڈبے کے

دروازے تک گیا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چلتی ٹرین سے چھلانگ لگا دی۔

جیسے ہی گاڑی رکی۔ میں نے اپنے ڈبے میں سے دو آدمیوں کو بھی ٹین کے بنے کنستر اٹھائے باہر لپکتے دیکھا۔ مجھے اب اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ یہاں اتنی سخت چیکنگ کیوں کی جاتی ہے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی سمگلروں کی ٹرین میں سفر کر رہا ہوں۔ جہاں ہر دوسرا مشتبہ ہے۔

بڑے ہوشیار لوگ تھے وہ پہلے ہی امتحان میں نئے آنے والوں کے کس بل نکال دیتے تھے اور ان کی اہمیت اور اہلیت کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ میں بھی ان کا نیا شکار تھا کبھی جی چاہتا میں بھی ان ہی لوگوں کے پیچھے ٹرنک لے کر اتر جاؤں اور اسی سٹور کے مالک کے منہ پر دے ماروں اس کے بعد جو ہو سو ہو لیکن اتنی ہمت اب مجھ میں نہیں تھی۔ کوئی طاقت بار بار مجھے کہہ رہی تھی کہ یہاں آنا جتنا آسان ہے واپسی اتنی ہی مشکل.....

میں بری طرح ان لوگوں کے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔

بہت بری طرح!

.....☆☆☆.....

گاڑی اب رک گئی تھی۔ اور ارد گرد کے باقی ڈبوں کے مسافر بھی ہمارے ڈبے کے سامنے تماشہ دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ قریباً پندرہ بیس منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی۔ انہوں نے مفرور کے ہاتھ ایک کپڑے سے پیچھے کی طرف باندھ رکھے تھے اور اسے دھکے دیتے ہوئے واپس لا رہے تھے پھر وہ اس کی ٹوکری سمیت اپنے خاص ڈبے میں منتقل ہو گئے۔

مسافر بھی اپنی جگہوں پر واپس پہنچ گئے وہ اس طرح کے واقعات دیکھنے کے شاید عادی ہوں کیونکہ کسی نے بھی اس پر حیرت کا اظہار نہ کیا۔ صرف وہ اس شخص کا جغرافیہ جاننے کے لیے متجسس نظر آ رہے تھے۔ گاڑی چل دی اور گرفتاری پر تبصرے شروع ہو گئے۔

خدا خدا کر کے مطلوبہ سٹیشن آیا اور مجھے اس گھٹن زدہ ماحول سے نجات نصیب ہوئی۔ سٹیشن پر اتر کر میں نے اس طرح سکھ کا سانس لیا جیسے لمبی قید سے رہائی حاصل ہوئی ہو۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی پہچان انہوں نے مجھے کرا دی تھی۔ میں وہاں موجود خفیہ پولیس والوں کی

نظروں سے بچتا بچاتا سٹیشن کی حدود سے باہر نکل آیا اور آہستہ آہستہ سٹیشن سے ہی منسلک بازار کی طرف چلنا شروع کیا۔ جہاں مجھے اگلی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔

اس سرحدی قصبے کا وہ شاید اکلوتا بازار تھا۔ میں ڈاک خانے کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی جیب سے سگریٹ کے ایک خاص برانڈ کی ڈبیا نکال کر ہاتھ میں اس طرح پکڑی کہ وہ سامنے سے آنے والے کو اچھی طرح دکھائی پڑے۔ اب میں خاصا سنبھل چکا تھا اور چوکنا ہو کر آنے جانے والوں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لے رہا تھا کیونکہ انہی میں میرا مطلوبہ شخص بھی موجود تھا۔

ڈاک خانہ سے منسلک ایک دکان سے میں نے پان خریدا اور منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ فی الوقت مجھے خود کو مصروف رکھنے کا اس سے بہتر اور کوئی بہانہ میسر نہ تھا۔

اس اثناء میں میں نے دکان میں لگے شیشے میں اس شخص کو دیکھ لیا تھا جو سٹیشن سے یہاں تک میرے تعاقب میں آیا تھا۔ اس کا احساس مجھے یوں ہوا کہ میں نے سٹیشن پر ہی اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ لیا تھا۔ وہاں شاید وہ واحد شخص تھا جو میرے ساتھ ساتھ یہاں تک آیا تھا۔

دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا یا پھر ہمارے گروہ کا اور میرا مطلوبہ آدمی، میں نے ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو دونوں طرح کے حالات کے لیے تیار کر لیا۔

.....☆☆☆.....

جس طرح موت کا خوف انسان کو دلیر بنا دیتا ہے اسی طرح گرفتاری کے خوف نے میرے جسم میں بجلیاں دوڑا دی تھیں۔ میرا رخ اب ایک مقامی تانگہ سٹینڈ کی طرف تھا۔ ابھی میں کچھ دور ہی تھا کہ کسی نے مجھے اس خفیہ نام سے پکارا جو مجھے گروہ کی طرف سے الاٹ ہوا تھا۔

میں اس کی طرف گھومتے ہوئے مطمئن تھا کہ یہ اپنا آدمی ہے۔ میرا مخاطب وہی شخص تھا۔ اس کی شاندار اداکاری پر داد نہ دینا زیادتی ہو گی کہ وہ اچانک ہی مجھ سے یوں بغل گیر ہوا جیسے ہم کوئی بہت پرانے ملنے والے ہیں۔

سارے راستے میرے ذہن میں وہ جاسوسی ناول چکراتے رہے جو میں اپنے علاقے کی لائبریری سے کرائے پر لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اور میں نے ایسے مواقع کے لیے اختیار کی جانے

والی تمام ہدایات بھی دہرالی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی بے تکلفی کے باوجود ابھی تک میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔ مزید اطمینان کے لیے ہم دونوں نے اپنی اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیاں نکالیں اور ایک دوسرے کو سگریٹ پیش کرنے کے بہانے ''دوسرا کوڈ'' بھی دہرا دیا۔ اب تیسرا اور آخری مرحلہ باقی تھا اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں پہلے ''ماموں'' کے گھر جاؤں گا یا چچا کے گھر۔

میں نے جواب میں ''ماموں کے گھر'' بتایا جبکہ وہ ''چچا کے گھر'' جانے کے لیے بضد تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر دیا کہ ''خالو'' کے ہاں چلتے ہیں۔ اب میں نے واقعی اطمینان کا سانس لیا۔ یہ ہمارا مطلوبہ آدمی تھا۔

ہم تانگے میں بیٹھ کر قریبی گاؤں روانہ ہو گئے۔

راستے میں اس نے مجھ سے میری شخصیت کے متعلق ایک لفظ بھی دریافت نہیں کیا تھا اور ارد گرد کے دیہات کی باتیں اس طرح دہرا رہا تھا کہ اب مجھے بھی یقین ہونے لگا جیسے میں یہیں کسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔

مختلف کچے پکے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دھکے کھانے کے بعد بالآخر ہم گاؤں پہنچ گئے۔ جہاں ایک معزز قسم کے چودھری نے مجھے خوش آمدید کہا میں اس کے ساتھ ہی ان کے ڈیرے پر آ گیا۔

عجیب بات یہ تھی کہ یہاں بھی کسی نے میرے متعلق تجسس ظاہر نہیں کیا تھا اس لمحے میرے ذہن میں مسز نادرہ کا وہ فقرہ گونج پیدا کر رہا تھا۔

''صرف اپنے کام سے کام رکھنا'' اور اس کا عملی نمونہ میں نے یہاں دیکھ لیا تھا۔

ڈیرے میں موجود لوگوں نے مجھے صرف ''تعظیم'' دینے پر ہی اکتفا کیا۔ میرا ہمراہی بھی اب مجھ سے الگ ہو گیا تھا اور وہی چودھری ہی مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔

پروہنے کے لیے غسل خانہ دیکھ کر میں تو حیران ہی رہ گیا۔ غسل سے فارغ ہونے کے بعد میری تواضع پر تکلف چائے سے کی گئی کیونکہ میں کھانے کی ضرورت سے فی الحال بے نیاز ہو چکا تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا کہ میرا مطلوبہ آدمی شام تک یہاں پہنچ جائے گا۔

میری خواہش پر ان لوگوں نے مجھے آرام کرنے کو ایک شاندار کمرے میں اکیلا چھوڑ دیا۔ میرا ٹرنک میرے قریب ہی رکھا تھا۔ کسی نے اس طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹا اور نیند کی آغوش میں سما گیا۔

.....☆☆☆.....

شام کے وقت میرا مطلوبہ آدمی وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی میری خیریت اور آرام میں کمی سے متعلق کوئی شکایت دریافت کی۔ پھر میرے سامنے ہی اس نے ٹرنک سے بریف کیس نکال کر کھولنا شروع کیا۔ بریف کیس کھولنے سے پہلے اس نے وہ مخصوص کوڈ بھی مجھ تک پہنچا دیا جو اس کی شناخت کے لیے مجھے بتایا گیا تھا۔

ہر نیا لمحہ میری حیرت میں اضافہ کر رہا تھا۔ ان لوگوں کی تنظیم اور کام کرنے کے طریق پر ششدر ہی تو رہ گیا۔ کتنے منظم تھے وہ لوگ۔

مجھے پہلی ہی مہم میں اس حقیقت کا احساس ہو چلا تھا کہ میرا واسطہ عام سے لچے لفنگوں سے نہیں بلکہ مہذب ڈاکوؤں..... کے ایک خطرناک گروہ سے ہے۔

وہ شخص جس نے مجھ سے بریف کیس لیا اس نے وہاں موجود لوگوں کو جو اس کے ماتحت معلوم ہوتے تھے، میری ''خاص خدمت'' کی ہدایت بھی کر دی تھی۔

''میرا نام چودھری نیاز ہے۔''

تھوڑی دیر بعد رخصت ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور دوسرے روز آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ مجھے اب یہاں سے بھی کچھ لے کر بیگم نادرہ کے حضور پہنچانا تھا جس کا علم مجھے یہاں آ کر ہوا۔ اس نئے حکم نے مجھے پھر گڑبڑا کر رکھ دیا۔ میں تو پہلے ہی خدا خدا کر کے یہاں پہنچا تھا۔ مارے خوف کے ان سے کوئی سوال بھی پوچھنے سے رہا۔ چپ کا ہو رہا۔ اب جانے اور کیا قیامت ٹوٹنے والی تھی۔

چودھری نیاز کی روانگی شام ڈھلے ہوئی تھی۔

یہ ''مال'' جو میں اپنے شہر سے لے کر آیا تھا اسی کو سونپنا تھا لیکن وہ براہ راست مجھ سے

نہیں ملا تھا۔ وہ اس گاؤں کا بھی رہنے والا نہیں تھا۔ ان لوگوں نے راز داری کا ہر ممکن طریقہ استعمال کیا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو نہ جان سکیں۔ مجھے اب نیاز کی واپسی کا انتظار تھا اس کے آنے پر ہی میرا واپسی کا سفر شروع ہوتا۔

سب کچھ بھول کر میں اب کوئی دوسرا طریقہ سوچنے لگا جس پر عمل کر کے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک سکوں۔ ظاہر ہے جس طرح سفر کر کے میں یہاں پہنچا تھا وہ طریقہ اب دہرایا نہیں جا سکتا تھا۔ کسی بھی لمحے پکڑے جانے کا امکان موجود تھا۔

.....☆☆☆.....

تھوڑی ہی دیر بعد جب میرے میزبان نے رات کے کھانے کا بندوبست کرنے کے لیے اجازت چاہی تو میں چودھری نیاز کی ''خاص خدمت'' کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ میں کمرے میں اکیلا تھا جب ایک خوبصورت لڑکی بے دھڑک اندر گھس آئی۔ میں تو جیسے سہم کر رہ گیا اور ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔

گاؤں کی تو وہ دکھائی نہیں دیتی تھی شاید شہر کی بھی کسی ماڈرن آبادی سے اس کا تعلق لگتا تھا۔ اسے یہاں صرف ''خاص خدمت'' ہی کے لیے انتہائی معقول معاوضے پر طلب کیا گیا تھا۔ جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اپنا ہاتھ ماتھے پر لے جا کر بڑی ادا سے جھکتے ہوئے اس نے مجھے سلام کیا۔ یہ سلام کرنے کا وہ خاص انداز تھا جو اس جیسی پیشہ ور لڑکیوں کے لیے مخصوص تھا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا اور منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ یہ لڑکی میرا مقصود نہیں تھی۔ میں نے اس اندھیر نگری میں آنکھیں بند کر کے چھلانگ ضرور لگا دی تھی لیکن ابھی میرا ضمیر بہرحال زندہ تھا۔ وہ لوگ جو میرے میزبان تھے اس پیشے کی روایات کا احترام ان کا فرض تھا۔ سو انہوں نے ادا کیا۔ لیکن مجھ پر کڑے امتحان کی گھڑی آن پڑی تھی۔

یہ میری تربیت کا امتحان تھا۔ میں اپنے ضمیر اور خدا کے سامنے جوابدہ تھا اور اس سلسلے میں کوئی جواب بھی پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا اس لڑکی سے جان چھڑاؤں۔ کہیں میرا ایمان بالکل ہی ڈگمگا نہ جائے اور منہ پھلا کر بیٹھ رہنا میرے اسی منصوبے کی کڑی تھی جس پر میں

اس حوازادی کے شر سے بچنے کے لیے عمل کرنے جارہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر پھر آہٹ ہوئی۔ دروازہ اسی نے کھولا۔ ایک مقامی شخص ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ ٹرے سے بھنے ہوئے مرغ کی اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی۔ ٹرے اس نے آنے والے کے ہاتھوں سے تھام کر سامنے میز پر رکھ دی نو وارد نے آنکھ بھر کر اس منظر کو دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کی تھی جیسے ہی ٹرے اگلے ہاتھوں میں منتقل ہوئی وہ جس طرح چپ چاپ آیا تھا انہی قدموں پر واپس لوٹ گیا۔

.....☆☆☆.....

اس کے باہر نکلتے ہی لڑکی نے دروازہ دوبارہ بند کر کے اس کا بولٹ بھی چڑھا دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کھیل شروع ہو گیا ہے۔ اب یہاں میں تھا، لڑکی اپنی تمام تر شیطانیت کے ساتھ تھی۔ یا پھر وہ شرافت جو میری ماں کے دودھ نے میرے خون میں انڈیلی تھی۔

آج اس خون کی پرکھ ہونی تھی۔ لڑکی نے ایک خاص زاویہ بناتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر ایک مرتبہ میرے چہرے کی سنجیدگی کو حیرانی سے دیکھا اور شراب کی بوتل کھول کر گلاس میں انڈیلنا چاہی۔

''ٹھہرو۔''

میں نے مضبوط ارادے سے کہا اور وہ اچانک میری طرف گھوم گئی۔

''میں پہلے کھانا کھاؤں گا۔''

میرا لہجہ سنجیدہ اور بارعب تھا۔

''لیکن جناب پہلے.....''

''بکومت! اور جو میں کہوں وہی کرو۔ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا۔''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑے اکھڑ لہجے میں اسے ڈانٹ پلا دی۔

ایک لمحے کے لیے تو اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ ابھی وہ اس صورت حال پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس بات کا تو اسے بھی بخوبی

اندازہ تھا کہ میں بقائمی ہوش وحواس باتیں کر رہا ہوں۔

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار واضح اور نمایاں تھے۔ شاید وہ کسی ذہنی کشمکش کی شکار نظر آ رہی تھی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے اندر اس وقت ایک ہی جنگ جاری تھی کہ وہ میرے رویے کو سچ جانے یا پھر میرا نخرہ یا اداکاری۔ مسکراتے ہوئے اس نے کمرے کی ایک الماری میں سجی جدید کراکری میں سجا کر کھانا میرے آگے رکھ دیا۔ اور خود بھی سامنے بیٹھ گئی۔ ہم دونوں نے کھانا شروع کر دیا۔

میں نظریں نیچے کئے کھا رہا تھا اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ وہ مجھے کم از کم اس گناہ سے بچا لے۔ کھانا اس نے میز ہی پر سجایا تھا اور ہم دونوں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ اس دوران کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے بھی جاتے تھے۔ میں نے تو اپنے چہرے پر خواہ مخواہ سنجیدگی طاری کر لی تھی لیکن اس نے اپنی پیشہ دارانہ تربیت کے مطابق نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکا رکھی تھی۔

ہم دونوں ایک ہی کیفیت کے شکار تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سنجیدہ تھا اور وہ اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے ہاتھوں خواہ مخواہ مسکراتے رہنے پر مجبور تھی۔ کتنے مجبور تھے ہم دونوں۔

''آپ کیا گونگے ہیں؟''

اس نے حوصلہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر میری سنجیدگی کا طلسم توڑنے کے لیے بازاری انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''اپنے کام سے کام رکھو۔ میری زبان بہت کم اور ہاتھ بہت زیادہ چلتے ہیں۔''

میں نے اس کی نقرئی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر ڈانٹ پلا دی۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے مجھے بے حد افسوس بھی ہو رہا تھا۔

.....☆☆☆.....

وہ پیشہ ور لڑکی تھی۔ اس کا واسطہ جانے کیسے مردوں سے پڑتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کچھ مردوں کو خواہ مخواہ عورتوں کے سامنے اپنی اہمیت جتلانے کا شوق ہوتا ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ

عجیب وغریب حرکتیں اور ڈرامے کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ پھر مسکرا کر چپ ہوگئی۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے ایچ باتھ میں ہاتھ دھوئے اور اس آرام دہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ جو وہاں میرے لیے خصوصی اہتمام سے بچھایا گیا تھا۔ پہلے تو وہ حیرانگی سے مجھے دیکھتی رہی پھر مسکراتی ہوئی میرے قریب آگئی۔

''دیکھو چپ چاپ سامنے چارپائی پر لیٹ جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ نہیں لینا دینا۔''

میں نے چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اسے ہاتھ اٹھا کر خبردار کیا۔

''آپ کمال کے آدمی ہیں۔''

اس نے قریباً روہانسی آواز میں زچ آجانے کے انداز میں کہا۔ شاید اسے یہ امید نہیں تھی کہ میں اس حد تک بھی جا سکتا ہوں۔ اس کے باوجود بے چاری نے پھر بازاری مسکراہٹ خود پر طاری کی۔

''میں کیا پسند نہیں آئی آپ کو..... کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ مجھ سے۔''

اس مرتبہ اس نے اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ اتنی بے باکی سے کیا کہ میں تھرا کر ہی رہ گیا۔

''میں جو بھی ہوں بس ایسا ہی ہوں اور ضروری نہیں کہ ہر برا آدمی اس حد تک بھی برا ہو۔ جس حد تک تم سمجھتی ہو۔''

میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی برقرار رکھی۔

''میں یہاں جس کام کے لیے آیا ہوں۔ مجھے اس کے علاوہ اور کسی بات سے کوئی غرض نہیں مجھے علم ہے تمہیں اس بات کا معاوضہ دیا گیا ہے کہ ساری رات میرا دل بہلاتی رہو۔ تم یہ سمجھ لو کہ تم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو اس چوٹ سے کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں۔

مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں کوئی گلہ نہیں، تم یقیناً بہت خوبصورت ہو لیکن میں شاید تمہارے معیار پر پورا نہ اتر سکوں۔

وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اپنا لہجہ قدرے نرم کر کے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''دیکھو! دنیا میں ہر کام اپنی مرضی سے نہیں کیا جاتا..... اس بات کو تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم یہاں کسی مجبوری کے ہاتھوں چلی آئی ہو؟ تمہیں بھی تو زندگی میں اپنی مرضی کے بغیر کچھ کرنا پڑتا ہے..... لیکن آدمی ایک حد تک ہی جا سکتا ہے۔ تم اپنا دھندہ کرو۔ میں اپنا دھندہ کر رہا ہوں۔ اگر ابھی جا سکتی ہو تو چلی جاؤ۔ میں تم سے خوش ہوا۔ تمہارا کام اب ختم ہو گیا۔ کوئی مجبوری ہو اور رات یہاں گزارنا ناگزیر ہے تو اس چارپائی پر اطمینان سے لیٹ جاؤ۔ صبح چلی جانا۔ اب مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ مجھے کل پھر ایک لمبا سفر کرنا ہے۔''

میں نے اپنی بات ختم کر کے اس کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''معاف کیجئے! میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی۔''

اس کی آواز میرے لیے ہی نہیں خود اس کے لیے بھی اجنبی تھی۔

میرے لہجے کی سچائی اس فاحشہ عورت کے اندر اتر گئی میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس نے میرے سرہانے رکھی سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے لائٹ آف ہونے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر تک نیند سے جدوجہد جاری کرنے کے بعد بالآخر میں سو گیا۔ وہ شاید ابھی تک جاگ رہی تھی۔

علی الصباح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے کھانے کی پلیٹ کو سگریٹوں کی راکھ سے بھرا ہوا پایا غالباً وہ رات دیر گئے تک سگریٹ نوشی سے اپنے اس روحانی گھاؤ پر مرہم رکھنے کا سامان کرتی رہی جو میں نے اسے لگایا تھا..... شاید ابھی اس کے ضمیر کو مکمل موت نہیں آئی تھی۔ میں اس صورتحال میں اس کے اندر ہونے والی نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے ذہنی اذیت پہنچائی تھی۔

میں بھی بہرحال مجبور تھا..... میں نے بیدار ہوتے ہی دبے پاؤں باتھ روم کی راہ لی۔ وہ شاید رات کے آخری پہر میں سوئی تھی۔ میں بے چاری کو جگا کر اس کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب نہانے سے فارغ ہو کر میں باہر نکلا تو روشندان سے سورج کی کرنیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں وہ اپنی چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ یہ رات بڑے کرب سے گزری ہے۔ مجھے باہر آتے دیکھ کر اس نے سلام کیا ابھی تک اس نے اپنے پیشہ وارانہ فرائض کو نہیں بھلایا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں ذہنی کوفت ہوئی۔ لیکن اس بات کا یقین کر لو کہ میں نے ارادتاً تمہیں دکھ نہیں پہنچایا۔''

میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہہ دیا۔

''خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجئے میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں..... یہ تو میرا ایمان کبھی نہیں رہا کہ دنیا نیکی سے خالی ہو گئی ہے، لیکن آج میں نے اس کا ثبوت بھی دیکھ لیا ہے۔ آپ اس دنیا میں رہ کر بھی عظیم انسان ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں جا گھسی۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر وہ چپ چاپ باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ناشتے کے ساتھ ہوئی۔ ہم دونوں نے ناشتہ بھی خاموشی سے کیا۔ دونوں ایک دوسرے سے شرمندہ تھے۔

جب ناشتہ ختم ہوا تو اس نے بڑی التجا سے درخواست کی کہ جب بھی ممکن ہو اس سے ضرور ملوں۔ اس نے اپنا ایڈریس جو مجھے دیا اس نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا۔ وہ میرے شہر کی سب سے ماڈرن آبادی میں رہتی تھی۔

.....☆☆☆.....

شام ڈھلے چوہدری نیاز واپس آ گیا۔ اس کی واپسی مسلح گھڑ سواروں کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک نے مجھے ایک بریف کیس تھما دیا سب سے پہلے اس نے میری خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ خدمت میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی تھی۔

میں نے اسے اطمینان دلایا کہ میں بہت خوش ہوں اور ان لوگوں نے میری مقدور بھر خدمت کی ہے۔ تھوڑی دیر تک اسی ڈیرے پر بیٹھے ہم گپ شپ کرتے رہے۔ چوہدری نیاز نے مجھے پوچھا کہ میں گھڑ سواری کر سکتا ہوں؟

میں نے ناں جواب دیا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔

اندھیرا اب آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا تھا جب وہ لوگ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے یہ روانگی کا اشارہ تھا۔ میں نے مقامی ڈیرے دار سے مصافحہ کیا۔

چوہدری نیاز نے مجھے اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے علم تھا کہ میرا باقی سامان خود بخود مجھے اپنے شہر موصول ہو جائے گا۔ چوہدری نیاز کے متعلق مجھے پہلے ہی روز اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس علاقے میں کس حیثیت کا مالک ہے۔

ہمیں یہاں سے پندرہ میل دور دوسرے اڈے پہ جانا تھا جہاں سے میں بغیر کوئی خطرہ مول لیے اپنے شہر پہنچ سکتا تھا۔ یہ شاید چاند کی ڈھلتی راتیں تھیں۔ ہم سیاہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ صبح مطلع صاف تھا لیکن شام گئے ہلکے ہلکے بادل آسمان پر چھانے لگے اور اب اچانک آسمان بادلوں سے گھر چکا تھا۔ جو سمگلروں کے لیے تائید غیبی سے کم نہیں ہوتا۔

دونوں محافظ آگے آگے تھے اور میں چوہدری کے ساتھ اس کی گھوڑی پر پیچھے پیچھے ابھی ہم بمشکل دو ڈھائی میل ہی چل پائے تھے کہ اچانک سامنے سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور سب سے آگے جانے والا گھڑسوار الٹ کر نیچے آ رہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہمراہی کے منہ سے عجیب و غریب آواز نکلی۔ یہ خطرے کا سگنل تھا جو اس نے اپنے مالک چوہدری نیاز کو دیا تھا۔

چوہدری نیاز کی گھوڑی خطرہ محسوس کرتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رکھا تھا کیونکہ میرا یہ زندگی میں پہلا سفر تھا ''گھبرانا نہیں باؤ جی! ستے خیراں۔''

چوہدری نیاز نے گردن موڑ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ کیا مجال کہ جو اس کے رویے سے ذرا سی بھی گھبراہٹ آشکار ہوئی ہو.....

یہ شاید ان لوگوں کے لیے معمولی بات تھی لیکن میرے لیے زبردست حادثہ۔ بہرحال اس کا مداوا ہاتھ پیر پھلانے سے ممکن نہ تھا۔ مجھے بھی اپنے ہمراہیوں کی سی جرأت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ معمولی گھبراہٹ یا بزدلی کسی بھی لمحے میری جان لے سکتی تھی۔ دوران سفر چوہدری اور اس کا دوسرا ساتھی رک رک کر فائرنگ بھی کرتے جا رہے تھے۔

ان کا گولی چلانے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ اپنے مدمقابل کو اپنی سمت کے متعلق دھوکے میں رکھ رہے ہیں۔ یہ گھیرے میں آئے ہوئے کسی بھی شخص کی بہترین تکنیک تھی جو ان لوگوں نے اپنا رکھی تھی دونوں منجھے ہوئے کمانڈوز کی طرح صورت حال سے نمٹ رہے تھے۔

چاروں طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی ہمیں گھیر کر مارنا چاہتا ہو۔ حملہ آور پہلے سے ہمارے لیے تاک کر کے بیٹھے تھے۔ قریباً گھنٹہ بھر وہ ہمیں دوڑاتے رہے۔ اس دوران چوہدری نیاز کا ساتھی وفادار کتے کی طرح سایہ بن کر اس سے چمٹا رہا اس نے ایسی پوزیشن لی ہوئی تھی کہ اگر چوہدری کی طرف کوئی بھولی بھٹکی گولی آ ہی جاتی تو اس کا پہلا شکار وہ خود بنتا۔

.....☆☆☆.....

ایک بات کا اندازہ میں نے بخوبی لگایا تھا کہ یہ لوگ گول دائرے میں گھوڑیاں بھگا رہے تھے..... سیدھے نہیں بھاگ رہے تھے۔ ان کی ہر ادا چونکا دینے والی تھی..... اب اس کا ساتھی ہم سے الگ ہو گیا تھا۔ یہ بھی ان لوگوں کے منصوبے کی ہی کوئی کڑی ہو گی۔ شاید وہ دشمن کو اپنے ساتھ الجھا کر اپنے مالک کو نکل جانے کا موقع دے رہا تھا۔

آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں یا پھر ان دعاؤں نے جو میں دل ہی دل میں زندگی بچ جانے کے لیے مانگ رہا تھا اس روز ہمیں بچا لیا ورنہ تو کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہمارے تعاقب میں ہونے والی فائرنگ کی آواز اب خاصی مدھم پڑنے لگی تھی۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ چوہدری نیاز اپنے دشمن کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ہم لوگ بھی اب ''ڈینجر زون'' سے باہر نکل آئے تھے۔

''معاف کرنا جوان تمہیں ہمارے ساتھ پہلی ملاقات ہی میں تکلیف اٹھانا پڑی۔ ان کم بختوں نے بھی آج کا دن ہی چنا تھا۔''

چوہدری نیاز نے ایک گاؤں کے قریب پہنچ کر آہستہ سے قہقہہ لگا کر یہ بات کہی تھی جیسے ہم آتش بازی دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں چوہدری صاحب! ایسی شرارتیں تو ہمارے بزنس میں ہوتی رہتی ہیں۔''

میں نے اس پر اپنی طرف سے یہ جتلانا چاہا کہ میں اس سچوایشن سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔ حالانکہ میں دل ہی دل میں سارے راستے دعائیں مانگتا آیا تھا کہ ''یا اللہ! آج مجھے بچا لے۔ آئندہ میری توبہ۔''

ہم لوگ گاؤں کے باہر بنی حویلی پر پہنچ گئے جہاں ایک طرف چارپائی پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دو آدمی الگ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ چوہدری کو دیکھ کر احترام سے کھڑے ہو گئے۔

''جگاؤ ان کو تیار ہو جاؤ''

اس نے گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سات رائفل

برادر گھوڑیوں سمیت موجود تھے۔

''ملک وال کے راستے پر سردار کے آدمیوں نے ہم پر حملہ کیا ہے۔ نیامت کو شاید گولی لگی ہے اور صرف شرفاان کا مقابلہ کر رہا ہے فوراً نکل جاؤ اگر مر گیا تو مجھے صبح تک سردار کے کم از کم چار آدمیوں کی لاشیں ملنی چاہئیں۔''

چوہدری نیاز کے لہجے میں جھلکتے قہرے سے میں بھی دل ہی دل میں سہم گیا۔

وہ اس طرح چوہدری کا حکم سن رہے تھے جیسے کسی تربیت یافتہ فوج کے سپاہی ہوں۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ڈیرے پر صرف دو آدمی رہ گئے۔ باقی..... اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

''چلو باؤجی! منزل کھوٹی نہیں کرنی چاہئے۔''

چوہدری نیاز نے ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کہا۔ روانگی سے پہلے اس نے یہاں موجود باقی لوگوں کو کچھ ہدایات دی تھیں اور قریباً پون گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم قصبے تک جا پہنچے۔ رات کے دو ڈھائی بج رہے تھے۔ جب ہم نے قصبے کے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔

.....☆☆☆.....

چوہدری نیاز نے اچانک روانگی کا فیصلہ کر کے مجھے چونکا دیا تھا اتنی خطرناک صورتحال سے گزرنے کے بعد مجھے یہی امید تھی کہ وہ جان بچ جانے پر شکر ادا کرے گا اور صبح ہونے سے پہلے اپنے اس ''محفوظ ٹھکانے'' سے قدم باہر نہیں نکالے گا۔ لیکن اس نے تو ذرہ برابر حالات کا اثر قبول نہیں کیا تھا اور مجھے باتوں ہی باتوں میں یہاں تک لے آیا تھا۔

ہم لوگ جس جگہ پہنچے تھے وہ بھی اس طرح کا ایک قصبہ تھا جس میں کل میرا قیام رہا تھا۔ یہ مکان جہاں ہم نے پناہ لینی تھی سارے قصبے سے الگ تھلگ اور ایک کونے میں موجود تھا..... دستک دینے پر کسی نے دروازے کے نزدیک آ کر ہماری شناخت دریافت کی اور ''نیاز'' کا لفظ نکلتے ہی کنڈی کھلنے کی آواز بھی مجھے سنائی دی۔

ایک مہربان صورت بوڑھا ہاتھ میں لالٹین پکڑے دروازے کے پیچھے سے برآمد ہوا تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ایک آرام دہ کمرے میں موجود تھے..... نہ چاہتے ہوئے بھی چوہدری نیاز کے اصرار پر مجھے دودھ کا گلاس نوش کرنا پڑا۔ پھر میں بستر میں جا گھسا۔

صبح آنکھ کھلی تو سورج چڑھ آیا تھا۔ چوہدری نیاز ناشتے کے بعد رخصت ہو گیا۔ روانگی پر اس نے ''بے آرامی'' کی معذرت کی تھی۔

واپسی کے لیے میں نے قدرے محفوظ طریقہ اپنایا۔ میں نے سوچ بچار کے بعد ایک لمبا اور تھکا دینے والا بالکل محفوظ راستہ اختیار کیا تھا۔ اس قصبے میں ایک لوکل بس کے ذریعے میں دوسرے قصبے میں پہنچا وہاں سے پھر شہر آ گیا۔

مجھے علم تھا کہ مقامی اور چھوٹے شاپوں تک چلنے والی بسوں کی عموماً چیکنگ نہیں ہوتی۔ اس شہر سے ایک ویگن کے ذریعے میں اپنے شہر واپس پہنچ گیا۔

.....☆☆☆.....

اس وقت وہ جنرل سٹور بند ہو چکا تھا۔ جہاں مجھے مال پہنچانا تھا۔ میں سیدھا گھر چلا آیا۔ راستے میں میں نے خود سے طویل جنگ لڑنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا تھا کہ صبح اس ذلیل دھندے سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑا لوں گا۔ بھلے مجھے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

دس ہزار روپیہ وکیل صاحب کو مل چکا تھا۔ میں کم از کم اس طرف سے تو مطمئن تھا۔ واپسی پر مجھے چوہدری نیاز نے ایک ہزار روپیہ دیا تھا جو ابھی تک جوں کا توں میرے پاس موجود تھا۔ رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے جب میں ایک رکشا کے ذریعے گھر پہنچا۔ ہمارے گھر کے برآمدے کی بتی ابھی تک جل رہی تھی جو انہونی سی بات تھی۔

''یا الٰہی خیر!''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اتنی رات گئے تک بتی کا جلتے رہنا کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ میں گھبرایا ہوا گھر میں داخل ہوا بہن نے مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا اور اسے آہستگی

سے خود سے الگ کر دیا۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے پوچھا۔

''بھیا! ماں کل سے اسپتال میں ہے۔''

اس نے روتے روتے مجھے آگاہ کیا۔

''اف میرے خدایا.....''

میرے تو پاؤں تلے زمین نکل گئی۔

خدا نہ کرے کہیں والدہ کو پھر ہارٹ اٹیک تو نہیں ہو گیا؟ سب سے پہلا خیال یہی میرے دل میں آیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر زور سے بھینچ دیا ہو۔

بہن کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ بمشکل اس نے اپنی حالت پر قابو پا کر مجھے بتایا کہ والدہ پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ دونوں ایک ہمسائی کی مدد سے ماں کو ہسپتال لے گئے تھے۔ بہن کی زبانی علم ہوا کہ ہسپتال والے ماں پر توجہ نہیں دے رہے۔ وہ تو ہمسائی کے ساتھ واپس آ گئی ہے اور میرا چھوٹا بھائی وہیں والدہ کے پاس رہ گیا ہے۔

میں نے بریف کیس کو ایک محفوظ جگہ رکھا۔ بہن کو ساتھ لیا اور اسی حالت میں باہر نکل آیا۔ جلد ہی ایک رکشہ میں ہم دونوں بہن بھائی ہسپتال کی طرف جا رہے تھے۔

سرکاری ہسپتال میں میری ماں وارڈ کے باہر رکھے ہوئے مریضوں کے ایک پلنگ پر کراہ رہی تھی میرا بھائی وارڈ کی نرس کی منتیں کر رہا تھا کہ وہ اس کی ماں کو دیکھ لے۔ لیکن وہ بڑی بے تکلفی سے راؤنڈ پر آئے ہوئے ایک ڈاکٹر سے خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو میرا خون کھول اٹھا۔

''اب سناؤ بیٹا! صبح کیا ارادہ ہے؟''

میرے اندر بیٹھا شیطان اپنی فتح پر مسکرایا۔

ماں مجھے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چھوٹے بھائی اور بہن کی تو رو رو کر آنکھیں.....

سوج گئی تھیں۔ میں نے درد سے کراہتی ہوئی اپنی ماں کو سہارا دے کر اٹھایا۔ دونوں بہن بھائیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور باہر چل دیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ بس چلتا تو ڈاکٹر اور نرس کا گلا گھونٹ دیتا۔ نرس نے مجھے اس طرح مریض کو اٹھا کر باہر لے جاتے دیکھا تو وہ بھاگ کر میرے پیچھے آئی۔

''کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟ تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ یہ ہسپتال کے قانون کے خلاف ہے۔''

اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

جواب میں مڑ کر میں نے اس کے ہسپتال کے قانون سمیت ٹھیٹھ پنجاب لہجے میں وہ کچھ کہا جسے سننے کے بعد اس کا ایک منٹ بھی وہاں ٹھہرنا ناممکن تھا۔

وہ بھاگی بھاگی غالباً کسی کو رپورٹ کرنے گئی تھی۔

یہ وارڈ ہسپتال کی سڑک کے قریب تھا نرس کی دوبارہ آمد سے پہلے ہی ہم والدہ کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر وہاں سے چل دیئے۔

میں اپنی ماں کو شہر کے سب سے مہنگے ہسپتال کی طرف لے جا رہا تھا۔

پانچ سو روپیہ تو اس خیراتی ہسپتال کا بھی دو دن کا.....خرچ نہیں تھا.....اور میں اپنی تنخواہ سے ماں کو بچانے نکلا تھا۔

ہت تیرے کی! میں نے دل ہی دل میں خود پر ملامت کی۔

.....☆☆☆.....

پرائیویٹ ہسپتال والوں نے ہمارا استقبال اس طرح کیا جیسے ہمارا تعلق کسی شاہی خاندان سے ہو۔ تھوڑی دیر بعد میری ماں ایک ایئر کنڈیشن کمرے میں ایک نرس اور ڈاکٹر کی مسلسل نگرانی میں زیر علاج تھی اور صبح تک وہ پرسکون نیند سو رہی تھی۔ میں اپنی بہن کو اس کے پاس چھوڑ کر بھائی کے ساتھ گھر واپس آیا۔

میں نے ہسپتال میں اپنی صرف ایک دن کی کمائی لٹائی تھی۔ اور بزعم خویش ماں کو بچا لیا تھا۔

اس لمحے.....شیطان نے مجھے خوب خوب ورغلایا اور دل و دماغ میں صرف ایک ہی بات سمائی تھی۔

اگر میرے پاس دولت نہ رہی تو میری ماں کبھی زندہ نہیں بچے گی؟ ملک الموت کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ میری ماں کا علاج حلال کی کمائی سے ہو رہا ہے یا حرام کی کمائی ہے؟

بھائی کو چھوڑ کر میں نے دوپہر تک لوٹ آنے کا کہا اور خود بریف کیس اٹھا کر اسی گناہوں کی دلدل کی طرف گامزن ہوا جو اپنی سطح پر ہوس اور لالچ کا جال بچھائے جانے کب سے مجھ ایسے بھٹکے پنچھیوں کی منتظر تھی۔ سٹور کا مالک مجھے دیکھ کر پہلے تو حیران ہی رہ گیا ان لوگوں کو ٹرین پر چھاپے اور چوہدری نیاز پر حملے کی اطلاع مل چکی تھی، اس نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور میری تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

قریباً پون گھنٹہ بعد اس کی کار مسز نادرہ کے بنگلے کی طرف اڑے جا رہی تھی جو بے چینی سے میری واپسی کی منتظر تھی۔

دو دن سے میں نے شیو نہیں کی تھی اور مسلسل جاگتے رہنے سے میرا حلیہ بگڑ گیا تھا آنکھیں چڑھی ہوئی اور چہرہ بے رونق۔

میں اسی طرح تھکا ماندہ مسز نادرہ کے حضور پہنچا۔ آج چوکیدار نے مجھے روکنے کی جرأت نہیں کی تھی اس نے مجھے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ گاڑی واپس چلی گئی اور ایک دربان مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں چند منٹ کے بعد بیگم صاحبہ کے سامنے میں اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔

.....☆☆☆.....

وہ میری آمد پا کر وہیں چلی آئی تھیں۔ میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب مسز نادرہ نے گزشتہ دو روز کے واقعات مجھے سنانے کے بعد میری جرأت اور ہمت کی داد بھی دینی شروع کر دی۔ گویا میری یہاں آمد سے پہلے ہی وہاں کی رام کہانی یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ ان لوگوں کے ہاتھ کتنے لمبے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے بخوبی ہو چلا تھا۔

جیسے ہی میں نے اپنی والدہ کی بیماری کا ذکر کیا تو اس نے صرف ہسپتال کا پوچھا اور ٹیلی

فون اٹھا کر نمبر گھمایا۔ ایک دو منٹ تک وہ کسی سے انگریزی میں گفتگو کرتی رہی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''ہمیں افسوس ہے ابھی تک مجھے تمہارے گھریلو حالات کا بھی صحیح علم نہیں ہو سکا۔ تم سے زیادہ اس خیال سے نہ پوچھا کہ تم اس کا برا نہ مناؤ۔ یوں بھی کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت مجھے پسند نہیں ہے۔ لیکن تمہیں چاہیے تھا کہ اپنی والدہ کی بیماری کا ذکر مجھ سے ضرور کرتے بہرحال آئندہ تمہاری غیر حاضری میں تمہارے گھر کی ہر طرح دیکھ بھال کی جائے گی۔ تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

اس نے مجھے تشفی دی اور یقین دلایا کہ میری والدہ بہت جلد روبصحت ہو جائیں گی۔ اس کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ مخاطب کے لیے اس کی کسی بات پر شک کا جواز ہی باقی نہیں رہتا تھا۔

نادرہ بیگم نے میرے ساتھ ناشتہ کیا۔

میں حیران ہو رہا تھا کہ میں اس کے متعلق کیا رائے قائم کروں۔ کل تک وہ کیا تھی آج کیا ہے؟ ذرا اطمینان نصیب ہوا تو میں صوفے پر بیٹھا بیٹھا ہی اونگھنے لگا۔

ڈرائنگ روم میں رکھے انٹرکام پر ایک مؤدب آواز نے مسز نادرہ کو مخاطب کر کے اطلاع دی کہ فلاح صاحب ملاقات کو آئے ہیں۔ ''فلاں صاحب'' کے نام پر میں چونکا۔ یہ بھی ملک کی مقتدر سیاسی ہستی تھی۔

''تم آرام کرو میں ابھی آتی ہوں''

کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی میں اسی آرام دہ صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا پھر نیند نے مجھے آلیا۔

.....☆☆☆.....

بیدار ہوا تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں نے غور سے ایک مرتبہ پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ کہیں میری آنکھیں دھوکہ نہ کھا رہی ہوں میں اسی صوفے پر لیٹا تھا اور کمرے کی تمام لائٹیں آف تھیں کسی نے میرے پاؤں سے جوتی اتار دی تھی تاکہ میری نیند میں خلل نہ پڑے۔ غالباً بیگم نادرہ نے ملازموں سے کہہ دیا ہوگا کہ مجھے جگایا نہ جائے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ابھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ کسی کو بلاؤں یا نہ بلاؤں۔ شاید کسی نے مجھے بیدار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہی دربان جو مجھے یہاں لایا تھا میرے پاس آیا۔ نادرہ بیگم گھر پر نہیں تھیں۔

اس نے مجھے ایک لفافہ دیا اور ایک ریڈی میڈ شلوار قمیص کا سوٹ تھما دیا۔ لفافے میں دس ہزار روپیہ اور نادرہ بیگم کا پیغام بھی تھا کہ کل کسی بھی وقت اس سے ملوں۔ دربان نے مجھے وہیں غسل کروایا اور جب میں غسل خانے سے نکلا تو پہلے روز ملنے والی خادمہ سامنے کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے حسب سابق مسکراتے ہوئے ایک خاص انداز سے مجھے سلام کیا اور بتایا کہ میز پر کھانا میرا منتظر ہے۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ واقعی مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی..... اس کی راہنمائی میں کھانے کی میز تک پہنچا جہاں ایک مؤدب بیرا کھانا میز پر سجائے اگلے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

''تم جاؤ''

میری ہمراہی نے اسے حکم دیا میں نے اخلاقاً اسے کھانے میں شمولیت کی دعوت دی تو اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ اس گھر کے نوکر مالکوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔

میں چپ کا ہو رہا تھا۔ نجانے اس سے بات کرتے ہوئے مجھے کیوں ہچکچاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔

مجھ پر ان لوگوں نے اتنے احسانات کا بوجھ ڈال دیا تھا کہ میں ان کا زر خرید غلام بن چکا تھا۔ مجھے علم تھا کہ بریف کیس میں جو مال ادھر سے ادھر جا رہا ہے اس کے ذریعے ان لوگوں کو لاکھوں روپے کا منافع ہوتا ہے جس میں سے چند ہزار روپے قربانی کے بکرے کو مل جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن وہ مجھے میرے تصور سے بھی زیادہ پے کر رہے تھے۔

.....☆☆☆.....

ایک رکشہ میں بیٹھ کر میں ہسپتال روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر علم ہوا کہ بیگم نادرہ کا فون موصول ہوتے ہی میری والدہ کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملنا شروع ہو گیا تھا۔ دو ڈاکٹر مسلسل ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ مسز نادرہ فی الوقت تو واقعی ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن گئی تھی۔

میری بہن نے مجھے بتایا کہ ایک وارڈ بوائے سات سو روپے کے بل سمیت دوائیاں رکھ گیا ہے۔ شام کو ہمیں دوائیوں کا ایک بنڈل تھما کر انہوں نے فارغ کر دیا۔ میں نے اپنی ماں کا چہرہ آج پہلی مرتبہ اتنا ہشاش بشاش دیکھا تھا اس کا یہ روپ دیکھنے کے لیے تو میں ترس گیا تھا۔ ہسپتال سے روانگی کے وقت ہمیں علم ہوا کہ ہمارے تمام بقایا جات ادا کر دیئے گئے ہیں۔

ہسپتال کی ایمبولینس ہمیں گھر چھوڑ گئی تھی۔ وقت رخصت ہمیں یہ اطلاع بھی دی گئی کہ ہفتے میں ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب والدہ کو دیکھنے ''ہمارے غریب خانے'' پر آیا کریں گے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ بیگم نادرہ کے حکم سے ہو رہا تھا۔

میں نے وہ ساری رات گھر پر گزاری۔ پرائیویٹ ہسپتال والوں نے 24 گھنٹے میں والدہ کی کایا پلٹ دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہیں ہوئیں ماں کو اس روپ میں دیکھ کر میرے دل میں بیگم نادرہ کا احترام دوچند ہو گیا۔ وہ یقیناً میری محسنہ تھیں۔

اگلے روز میری ماں نے بہن اور بھائی کو پڑھنے بھیج دیا ہم نے محلے کی ایک بیوہ عورت کو گھر پر ملازم رکھ لیا تھا اور گھر کا کام کاج اب وہی کرتی تھی۔ دس گیارہ بجے جب میں باہر جانے لگا تو میری ماں نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔

''بیٹا! یہ تمہاری کیسی نوکری ہے کیا اوقات کار ہیں تمہارے۔ اور اتنی تنخواہ کب سے ہوگئی۔''

میں جس بات سے ڈر رہا تھا وہ میری ماں نے کر دی لیکن اس کا جواب تو میں نے پہلے ہی روز تیار کر لیا تھا۔

''میں اب کیشن پر اپنا کام بھی کرتا ہوں، ماں میری ترقی بھی ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ سفر پر رہنے کی وجہ سے ٹی اے اور ڈی اے بھی خاصا بن جاتا ہے۔''

اس بے چاری کو ان باتوں کا کیا علم کہ یہ کم بخت ٹی اے اور ڈی اے کیا ہوتا ہے اور میری ماں بے چاری مطمئن ہوگئی وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگی کہ اس کا بیٹا اتنا قابل اور لائق ہے۔ اس ستم ظریفی پر میں تڑپا تو ضرور لیکن کیا کرتا؟

''میں تمہیں کہتی تھی؟ ایک نہ ایک روز تمہاری محنت ضرور رنگ لائے گی اور اللہ تعالیٰ ہماری تمام مشکلات ختم کر دیں گے۔''

میری ماں نے میرے حق میں سینکڑوں دعائیں مانگنے کے بعد اپنی شفقت نچھاور کی۔

''اچھا ماں میں چلتا ہوں..... خدا حافظ''

''اللہ تیرا نگہبان ہو بیٹا۔''

ماں دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی۔

.....☆☆☆.....

میں دروازے سے ابھی باہر ہی نکلا تھا کہ اچانک ایک کار گلی کے باہر رکنے کی آواز آئی۔ دوسرے ہی لمحے بیگم نادرہ اس سے برآمد ہوئی۔ مجھے ہکا بکا چھوڑ کر میری طرف مسکراہٹ اچھال کر ہمارے گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

اس کا طریقہ واردات قابل داد تھا۔

وہ اپنے شکار پر مسلسل اور متواتر اتنے احسانات کرتی چلی جاتی تھی کہ کوئی شخص بھی اس کی غلامی سے نکلنا پسند نہیں کرتا تھا اور ایک ایسا مرحلہ آجاتا کہ جب اس کا ''شکار'' اس کا ''بندہ بے دام'' بن کر رہ جاتا تھا۔

میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا کہ ملک کی اتنی بڑی اور عظیم خاتون اس علاقے میں جہاں ہمارا قیام تھا گزرنا بھی پسند کرے گی۔ یہاں تو سالوں بعد کبھی کوئی ووٹ مانگنے ہی آیا کرتا تھا۔

تین دن تک مجھے فارغ ہی رکھا گیا۔ فارغ یوں کہ مجھ سے کوئی نیا کام نہیں لیا گیا۔ لیکن معروف میں یوں رہا کہ مسز نادرہ کی طرف سے ہر روز مجھے کسی نہ کسی کے ساتھ دن اور رات کے مختلف اوقات اور مختلف نوعیت کے ڈنر اور لنچ کھانے پڑے یوں جاننے کہ سارا سارا دن شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں گھوم پھر کر ''ایٹی کیٹس'' اور ''مینرز'' کی تربیت پاتا رہا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی میری ٹریننگ کا ایک ضروری حصہ ہیں۔ دکھائی پڑتا تھا کہ مسز نادرہ نے میرے متعلق کوئی اہم فیصلہ کر رکھا ہے۔

ان تین دنوں میں مجھے پستول چلانا بھی سکھا دیا گیا جس کے لیے بیگم صاحبہ کے ایک خصوصی کارندے کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ شخص اپنی جیپ میں مجھے اکثر شہر سے باہر ایک ''ڈیرے'' پر لے جایا کرتا جہاں مختلف ساخت کے پستول اور ریوالور لوڈ کرنے اور فائر کرنے سکھائے جاتے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ روزانہ میں کم از کم سو فائر کرتا۔ اس طرح وہ لوگ میری جھجک ختم کرنا چاہتے تھے پھر ایک ننھا سا پستول بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔

گروہ کے لوگوں پر میرے پہلے کارنامے نے ہی میری بہادری کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ جب بیگم نادرہ کو میں نے بریف کیس یہاں سے اس سرحدی علاقے تک لے جانے کا قصہ سنایا جس کیلئے ایک چھٹی پر آئے فوجی کا سوانگ رچایا تھا تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''تم نے یہ طریقہ کہاں سے سیکھا؟''

اس نے فوراً مجھے پوچھا۔

''ایک جاسوسی ناول سے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اوہ!''.....بیگم نادرہ کے ہونٹ گولائی اختیار کر گئے۔''ونڈرفل۔''

اس نے مجھے داد دی۔تم ضرور بڑے آدمی بنو گے۔

چوہدری نیاز نے بھی میری بہادری کی کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی تھی۔اب بیگم نادرہ کے نزدیک ایک بہادر چالاک اور پھرتیلا شخص تھا جس سے وہ خطرناک کام لے سکتی تھی۔

یہ معمولی بات نہیں تھی کہ میرا پہلا امتحان ہی اتنا خطرناک تھا اور اس سے سرخرو ہو کر نکلا۔

بیگم نادرہ کی ذاتی ملازمت میں آنے کے بعد میں نے کبھی بھول کر بھی اپنی پرانی فرم کا رخ نہیں کیا تھا بیگم نادرہ نے مجھے کہا تھا کہ وہ اپنے گروہ کے لوگوں سے صرف اس بات کی امید رکھتی ہے کہ وہ اس کی ہدایت کو حکم جانیں اور کبھی وہ کام نہ کریں جس سے انہیں منع کیا جائے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

میرا سابق صاحب کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا تھا لیکن اس کی حیثیت بیگم نادرہ کے نزدیک معمولی کارندے کی سی تھی۔اس کے علاوہ میں نے کبھی بھی کسی جرائم پیشہ شخص کو اس کے نزدیک پھٹکتے نہ دیکھا تھا۔

اس کے معمولات میں بھی تبدیلی نہ آئی۔ ہر روز وہ کسی نہ کسی عوامی میٹنگ میں موجود ہوتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کی تصاویر اخبارات کی زینت بنتیں۔

میں نے بڑے بڑے اخبارات کے رپورٹروں کو اس کے سیکرٹری سے ''بھیک'' پاتے دیکھا۔جی ہاں! میں تو اسے بھیک ہی کہوں گا جس کا تقاضا گو کہ منہ سے نہیں کیا جاتا اور جس کا علم بھی دینے والے کے سوا صرف خدا کو ہی ہوتا تھا۔

روزانہ بیگم نادرہ کے سامنے ضرورت مندوں کی ایک لسٹ پیش ہوتی تھی وہ ان معاملات میں خصوصی دلچسپی لے کر اپنی مقدور بھر کوشش سے لوگوں کے کام کرواتی تھی۔

میں نے کئی بیواؤں، محتاجوں اور یتیموں کو اس کے لیے دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتے دیکھا۔

.....☆☆☆.....

بیگم نادرہ نے بالکل سچ کہا تھا کہ اگر میں اس شہر کے چوراہے میں چلا چلا کر بھی لوگوں کو بیگم نادرہ کے اس روپ سے آگاہ کرتا جس کا نظارہ میں نے کیا تھا تو کوئی بھی میری بات پر کان نہ دھرتا۔واقعی لوگ مجھے پاگل سمجھتے۔

دو مہینے میں، میں نے قریباً دس چکر لگائے تھے اور ان دس چکروں میں ہر ''پھیرا'' کامیاب ثابت ہوا تھا۔اس سلسلے میں ہر دفعہ میں نے مختلف بہروپ بھرے تھے اور اب جہاں میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا وہاں میرا شمار بھی گروہ کے اعلیٰ کارکنوں میں ہونے لگا تھا۔میں نے سکوٹر خرید لیا تھا۔

گھر کی حالت بدلنی شروع ہو گئی۔میری بھولی بھالی ماں بیچاری دن رات میری مزید کامیابیوں کی دعائیں مانگتی رہتی۔ہمارا کام اکثر چاند کی پہلی یا آخری راتوں میں ہوا کرتا تھا۔یہ صورت بمشکل دس گیارہ دن قائم رہتی تھی۔مہینے کے پانچ چکر ہی لگانے پڑتے تھے۔

جب میں نے اس گروہ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ان دنوں کام زوروں پر تھا۔اسی لیے مجھے اتنے چکر لگانے پڑے تھے۔ابھی تک میری سمجھ میں صرف یہی بات آ سکی تھی کہ یہ لوگ سمگلر ہیں اور ان کے روابط ملک کی بڑی بڑی ہستیوں سے قائم ہیں جن کو وقتاً فوقتاً استعمال کر کے یہ اپنے کام نکلواتے رہتے ہیں۔

.....☆☆☆.....

ماں کی صحت کافی سنبھل چکی تھی۔بہن بھائی کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔والد کی کمی کا احساس یوں تو انہیں کبھی نہیں ہوا تھا بلکہ میری طرح ان کی بھی یہی خواہش رہتی تھی کہ وہ گھر آیا ہی نہ کریں۔لیکن جب سے والد صاحب کی کایا پلٹی تھی۔ہماری گم شدہ محبتیں جیسے واپس لوٹ آئیں تھیں۔گھر کا ہر فرد والد کی کمی بہت شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔میں نے شاید بہت پہلے گھر

میں والد کے لچھن دیکھ کر لاشعوری طور پر ان کی جگہ لینے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، یہی وجہ تھی کہ گھر میں مجھے بڑے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

میری بھی یہی کوشش رہی تھی کہ ماں، بہن، بھائی کو کسی دکھ کسی کمی کا احساس نہ ہونے دوں۔ کم از کم ان کی تعلیم ادھوری نہ رہے۔

عدالت میں دو مہینوں کے بعد میرے والد کی تاریخ نکل آئی اور اب مسلسل پیشیاں ہو رہی تھیں۔ جو گواہیاں اور شواہد ان کے خلاف پیش ہوئے تھے ان کے بعد والد صاحب کے اس معاملے سے مکمل بری الذمہ ہونے کی امید عبث تھی۔ ہمارا وکیل صرف بحث برائے بحث میں عدالت کا وقت ضائع کر رہا تھا۔ ورنہ تو اسے بھی کیس کا انجام نظر آ ہی رہا تھا۔

مجھے فیصلے سے ایک روز پہلے وکیل صاحب نے بتایا کہ کیس کی نوعیت بہت خطرناک ہے اگر جج نے بری کر دیا تو اس کی ''دیانت داری'' پر ہر کوئی شک کرنے لگے گا۔ کیونکہ قانون کی کوئی بھی دفعہ والد کو تحفظ نہیں دے سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سزا میں کمی کر دے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی سرکاری وکیل کو ہاتھ میں لینا پڑے گا اور اس کی فیس الگ ہو گی۔

مجھے پہلے ہی سے طریقہ واردات کا علم تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم تھا کہ فیسوں کا یہ سلسلہ ابھی بہت دور تک جائے گا یہاں سوائے پیسے کی زبان کے اور کوئی زبان کسی کو سمجھ آ ہی نہیں سکتی تھی۔

دس ہزار سے بڑھ کر اگر بیس ہزار پر بھی جان چھوٹ جائے تو غنیمت تھا۔

''کچھ بھی ہو وکیل صاحب پیسوں کی پرواہ نہ کریں اور ہر طریقہ استعمال کریں۔''

میں نے وکیل کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! جناب مجھے تو آپ سے پیسوں کے معاملے کی اجازت ہی لینی تھی۔ باقی کام تو دنیا کے ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

اس نے عیاری سے دانت نکالتے ہوئے اپنے منشی کو میرے لیے چائے لانے کو کہا۔

.....☆☆☆.....

فیصلہ کی تاریخ پر عدالت میں میرے علاوہ میری بہن اور بھائی بھی زبردستی چلے آئے تھے۔ میری ماں اور بہن کو والد سے ملے آج تین سال ہونے کو آئے تھے۔

اب پہلی والی بات بھی نہیں تھی گو کہ میں نے ابھی اس معاملے میں مسز نادرہ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا تھا پھر بھی کچھ معاملات میں نے خاصے سلجھا لیے تھے اب کسی اخبار کے رپورٹر کی یہ جرأت نہیں تھی کہ ہمارے خاندان کی پگڑی اچھالتا پھرے۔

اب کوئی میری ماں بہن کی تصویر ''ملزم کی بیوی اور بیٹی'' کے حاشیے کے ساتھ شائع نہیں کر سکتا تھا..... میں نے شرافت اور غنڈہ گردی دونوں میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

میں نے ملزموں کو لانے والی پولیس گارد کے انچارج سے درخواست کی تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنا قانون بدل لے اور ہمارے والد کو دوسرے ملزموں سے علیحدہ کر کے ان سے ہماری ملاقات کروا دے۔ پہلے تو ظاہر ہے اس نے نہ نہ کی لیکن ''نسخہ کیمیا'' نے اثر کیا اور وہ ''صوفی صاحب'' کو علیحدہ ہم سے ملاقات کروانے لے آیا۔ ہم لوگ عدالت سے ہٹ کر ایک باغ میں بیٹھے اپنے والد صاحب سے گفتگو کرتے رہے۔

میرے والد جب سے جیل گئے تھے کم بات کرتے تھے شاید احساس گناہ بہت شدت اختیار کر گیا تھا۔

میری شدید خواہش تھی کہ اپنے والد کو اس احساس کی شدت سے نجات دلا سکوں۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا اس کا کفارہ تو وہ کبھی کے ادا کر چکے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی نوابوں

کی طرح بسر کی تھی اور اب ان کی جو حالت تھی وہ بھی ہمارے سامنے تھی۔

قید کے بعد ان کا بتا ولہ ہم نے اپنے شہر کی جیل میں کروالیا تھا۔

میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے گھر بھینس باندھ دی تھی۔ ڈپٹی جیلر کے گھر نیا ٹیلی ویژن پہنچا دیا تھا اور جیل حوالدار کی علیحدہ تنخواہ لگا دی تھی۔

مجھے علم تھا کہ میرے والد جس طرح جیل کاٹ رہے ہیں۔ بڑے بڑے جغادری بدمعاش بھی نہیں کاٹ سکتے۔ ان کو بیرک کے بجائے غیر قانونی طور پر بی کلاس کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ صرف اعلیٰ افسران کے معائنے والے دن ہی وہ ایک آدھ دن کے لیے بیرک میں منتقل ہوتے تھے ان سے تو کیا مشقت لی جاتی۔ الٹا ایک مشقتی ان کو جیل کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اکثر ان کے لیے کھانا گھر سے جاتا تھا۔

لیکن.....

اس سب کچھ کے باوجود جیل بہرحال جیل تھی۔ آزادی کا تصور ہی ان سب نعمتوں سے بہت ارفع تھا۔

میری والدہ نے ان سے اب تک صرف تین مرتبہ ملاقات کی تھی۔ ہر دفعہ ہم لوگ عام قیدیوں سے الگ ملاقات کیا کرتے تھے لیکن میں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی کہ ماں سے ملنے کے بعد میرے والد کئی کئی دن کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔

وہ اس کے سامنے ہماری باتوں کا جواب صرف ''ہوں، ہاں'' ہی میں دیا کرتے۔ میں اپنی لاکھ کوشش کے باوجود ان کو احساس گناہ کی اس اذیت سے نجات نہ دلا سکا میں نے آج تک ان کو ماں کی بیماری کے متعلق نہیں بتایا تھا اور یہی ہدایت میں نے بڑی سختی سے اپنے بھائی بہن کو بھی کر رکھی تھی۔ اب تو وہ خود بھی خاصے سیانے ہو گئے تھے اور انہیں علم تھا کہ والد کو کس بات کا علم ہونا چاہیے، کس کا نہیں؟

اس روز میری ماں بہن اور بھائی نے والد سے جی بھر کر باتیں کیں ہم ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے کہ وہ انشاء اللہ بری ہو جائیں گے۔ لیکن وہ بچے نہیں تھے۔ انہیں علم تھا کہ انہوں

نے کتنا سنگین جرم کیا ہے؟ وہ تو اتنی کم سزا ملنے کو بھی معجزہ ہی سمجھتے تھے۔

پیشی ہوئی۔

دوپہر تک وکلاء کی بحث کے بعد عدالت نے ان کی تین سال کی سزا معاف کر دی اور دو سال سزا رہنے دی۔ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔

میری دو تین مہینے کی کمائی نے وہ کام کر دکھایا تھا جو شاید میری ماں کی صدیوں کی دعائیں بھی نہ کر پاتیں۔ فیصلہ کرنے کے بعد عدالت برخاست ہو گئی۔

میرے والد اس روز ایک مرتبہ پھر مجھ سے لپٹ کر رو دیئے۔ ہم دونوں باپ بیٹا ہی نہیں رو رہے تھے عدالت میں موجود تمام لوگوں کے دل بھی یقیناً ہمارے ساتھ رو رہے ہوں گے۔ وہاں موجود تمام لوگوں نے میرے والد سے کہا کہ اس کے بیٹے کی ہمت نے اس کی سزا کم کروائی ہے ورنہ تو دنیا کا کوئی قانون اس کے معاملے میں نرمی نہیں کر سکتا۔

میرے وکیل کے علاوہ اور کئی وکیلوں نے ہمیں مبارکباد دی۔

کاش میں ان عقل کے اندھوں کو بتا سکتا کہ میری ہمت اور ماں کی ریاضت نے نہیں ''سرکاری وکیل کی فیس'' نے ان کی سزا کم کروائی تھی۔

جس طرح کا کیس ان کے خلاف محکمے نے تیار کیا تھا اس سے بری ہونا ناممکن تھا۔

مجھے اب اچھی طرح سمجھ آنے لگی تھی کہ گناہگاروں کو بے گناہ اور بے گناہوں کو گناہ گار ثابت کرنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟

جیل سے واپس جاتے ہوئے میرے والد نے مجھے کہا۔

''بیٹا! میں تو یہ سمجھتا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کی۔ لیکن آج مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ضرور میں نے کوئی ایسا نیک کام کیا ہوگا جو قدرت نے مجھے تم سا بیٹا عطا کیا ہے۔ مجھے معاف کر دینا بیٹا! میں نے ہمیں تمہیں برباد کرنا چاہا لیکن تمہاری ماں کی دعاؤں نے.....''

ان کا فقرہ نامکمل ہی رہا کیونکہ شدت جذبات سے ان کا گلا رندھ گیا۔

میں سعادت مند بیٹے کی طرح سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بات کہہ کر اپنے باپ کو اور رلاؤں۔ شاید زندگی میں کسی لمحے میں نے اپنے والد سے اس شدت سے نفرت نہیں کی تھی جس شدت سے آج میں ان کے لیے محبت محسوس کر رہا تھا۔

کتنا عجیب ہے یہ قانون فطرت بھی؟

میرے والد واپس جیل چلے گئے۔ انہوں نے قریباً ایک سال قید کاٹ لی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ دوسرا سال بھی پلک جھپکتے ہی گزر جائے گا۔ اس روز میری ماں ساری رات مصلے پر سجدہ ریز آنسو بہاتی رہی۔ اس نے رات میں درجنوں بار مجھ پر پڑھ پڑھ کر پھونکا، محلے کے لوگوں کے نزدیک میں ''ہیرو'' بن چکا تھا۔

ایسے باپ کے لیے ایسی خدمات انجام دینے والا بیٹا آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ہر کوئی میری ہمت کی داد دے رہا تھا کہ نوجوانی میں نہ صرف گھر بار سنبھال لیا، بلکہ گھر بار کو بچا بھی لیا اور میں دل ہی دل میں بیگم نادرہ کو دعائیں دے رہا تھا کہ اس حرام کی دولت نے ہمیں تباہ ہونے سے بچالیا۔ مجھے خوشی تھی تو صرف اس بات کی کہ میں نے حتی الوسع اپنے باپ کے ساتھ کیا ہوا شریفانہ عہد نبھایا۔

.....☆☆☆.....

چند روز بعد میں ایک خطرناک مہم پر جا رہا تھا۔ دراصل بڑے بڑے مگرمچھوں کی آپس میں شدید دشمنیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے گروہ کے مخالف بھی ایک دو گروہ تھے اور یہ تمام لوگ ہر وقت ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے چکر میں رہتے تھے ایک دوسرے کی تاک میں رہتے تھے کہ موقع ملتے ہی چوٹ کر جائیں۔ ہمارا کچھ مال علاقہ غیر سے آ رہا تھا۔ بیگم نادرہ کو شک تھا اس کے کسی آستین کے سانپ نے دشمن گروہ کو اطلاع پہنچا دی ہے اور وہ کسی بھی ''کچے آدمی'' کو اس مہم پر روانہ کرنے پر رضامند نہیں تھی۔

بالآخر نظر انتخاب مجھ پر ٹھہری کیونکہ میں کافی کارنامے سرانجام دے چکا تھا۔

.....☆☆☆.....

کام خطرناک تھا مجھے ایک ٹرک کے ہمراہ صوبہ سرحد سے پنجاب تک سفر کرنا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہم نے راستے میں آنے والی چیکنگ پوسٹوں کو خرید رکھا ہے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا مجھے علم تھا کہ مخبری کی صورت میں ''سپیشل ناکے'' لگائے جاتے ہیں اور ان لوگوں کو اپروچ کرنا بسا اوقات ناممکن ہوتا ہے۔

میں تین روز پہلے پشاور پہنچ گیا۔ جہاں سے ایک ساتھی کے ذریعہ علاقہ غیر سے مال وصول کرنا تھا۔

میرا قیام پشاور کے ایک شاندار ہوٹل میں تھا۔ شام کا وقت تھا جب کسی نے دروازے پر بڑے مہذب انداز میں دستک دی میرے ان دیکھے ساتھی کو بھی چونکہ آج رات تک مجھ سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ اس لیے میں نے بڑی لاپرواہی سے دروازہ اس امید پر کھول دیا کہ یہ میرا ساتھی ہوگا یا ہوٹل کا کوئی آدمی لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

نووارد نے مہذب لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی شکل بھی شریف آدمیوں جیسی تھی لیکن ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کی نالی میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

معاملے کی نزاکت کو سمجھنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ لیکن یہ موقع پچھتانے کا نہیں تھا کہ چڑیوں نے کھیت تو کبھی کا چگ لیا تھا۔

''خوش آمدید''

میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا، میں خود کو کسی بھی پہلو سے کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک سفاک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔

''بیٹھ جاؤ''

اس نے سامنے بڑے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

''لیکن ٹھہرو''

اچانک دوسرا حکم موصول ہوا۔

''کیا بات ہے۔ ڈر گئے تھے کیا؟''

میں اب پہلے والا ارشد نہیں رہا تھا۔

''دیوار کی طرف رخ کر کے ہاتھ اوپر اٹھالو۔''

اس نے میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلا حکم دیا میں نے بلا چون و چراں اس کے حکم کی تعمیل کی۔اس نے بڑے اطمینان سے میری جیکٹ کی جیب سے پستول نکال لیا۔

''ٹھیک ہے!اب بے شک آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

''شکریہ!''

میں نے منہ لٹکایا اور اس کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''نئے پھنسے ہو شاید۔''

اس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کام کی بات کرو''

میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''دیکھو دوست! میری تمہاری کوئی دشمنی تو ہے نہیں۔ہمیں یہ تو علم ہے کہ پرسوں تمہارا مال آرہا ہے۔کس پوسٹ سے اور کس راستے سے آئے گا یا جائے گا اس سے بے خبر ہیں کوشش البتہ جاری ہے ممکن ہے کل تک مزید پیش رفت ہو۔میری بات اطمینان سے سننا اور اس پر غور کرنے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچنا کیونکہ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔دشمن نہیں۔صرف یہ بتادو کہ تم نے کہاں سے مال وصول کرنا ہے اور کس راستے واپس جانا ہے؟ ہمارا تمہارا یہ شریفانہ معاہدہ کہ تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا اور اس خدمت کا معقول معاوضہ بھی جو کم از کم 20 ہزار ہے تمہیں ایڈوانس مل جائے گا۔''

اپنی بات ختم کر کے اس نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''غور کرنے کے لیے کیا مجھے کل تک مہلت نہیں ملے گی۔''

بظاہر میں نے اس کا تمسخر اڑایا۔

''بے وقوف مت بنو۔وقت کی اہمیت کا احساس تمہیں بھی ہے اور مجھے بھی۔پھر

ہمارے پیشے میں قتل کرنا کوئی بہت انہونی بات تو نہیں ہے۔

''اس کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔''

''لیکن میں اتنا اہم فیصلہ اتنی گھٹی گھٹی فضا میں کیسے کر سکتا ہوں۔''

میں نے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا مطلب یہ ہے گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔''

اس مرتبہ اس کے لہجے میں اس کی اصلیت دکھائی پڑتی تھی۔

''گھی اگر انگلیوں سے نکل سکتا تو تم جیسے گدھے کس لیے بھرتی کیے جاتے''

میں نے اس کو چڑایا۔

اس طرح اسے طیش دلا کر میں کسی بھی کمزور لمحے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔اس نے میرے کمرے میں رکھے فون پر نیچے کسی سے پشتو میں بات کی اور مجھے احساس ہو گیا کہ وہ ہوٹل ان لوگوں کے کنٹرول میں ہے۔

فون کے خاتمے پر دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور اس کا ساتھی اندر داخل ہو گیا۔

دروازہ پھر بند ہو گیا۔نووارد نے آتے ہی اپنی جیب سے ایک لمبا چاقو نکال لیا۔وہ شکل ہی سے کوئی پیشہ ور جلاد دکھائی دیتا تھا۔

''برخوردار کو ذرا آٹے دال کا بھاؤ بتادو۔''

اس نے میری طرف پستول سے اشارہ کیا اور نووارد اس طرح جھکا جیسے وہ کوئی سدھایا ہوا کتا ہو اور اب اپنے ''رنگ ماسٹر'' کے حکم پر کرتب دکھانے جا رہا تھا۔اسے شاید انہیں معاملات سے نمٹنے کے لیے بھرتی کیا گیا تھا۔وہ بڑے خوفناک ارادے سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔

''ایک منٹ''

پہلے آنے والے نے جلاد کو رکنے کا اشارہ کیا۔

''اس بات کا تو تمہیں علم ہو گا ہی کہ یہ کمرے عموماً ساؤنڈ پروف ہوتے ہیں ہم لوگ اپنی تفتیش کی ابتدا جسم کے مختلف اعضاء کاٹنے سے کریں گے جب تمہارے خوبصورت جسم میں

صرف دو ہی سوراخ ہوئے تو سارا مسخرہ پن بھول جاؤ گے۔ میرا خیال ہے کٹی ہوئی ٹانگ اور ہاتھ کے ساتھ زندگی بسر کرنا خالہ جی کا کھیل نہیں۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر میرے چہرے کی بدلتی کیفیتوں کا جائزہ لیا پھر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم پیسہ کمانے نکلے ہو برخوردار اور اس کے حصول کا یہ تو کوئی طریقہ نہیں جو تم نے اپنا لیا ہے بچے نہیں ہو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم اس گروہ کے لیے صرف اس وقت تک کام کے ہو جب تک تمہارا جسم سلامت ہے۔ کوئی اعضاء کٹنے کے بعد تمہاری حیثیت ان کے نزدیک خارش زدہ کتے جتنی بھی نہیں رہ جائے گی۔ تم نے ابھی بیگم نادرہ کا یہی روپ دیکھا ہے برخوردار! میں نے کہا ناں کہ تم نئے شکار لگتے ہو۔"

دوبارہ رک کر اس نے اگلے حملے کی تیاری کی اور بڑے سفاک لہجے میں بولا۔

"یوں بھی لنگڑے گھوڑے کا علاج سوائے گولی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ خواہ اس نے مالک کے لئے کتنی ہی خدمات انجام دے رکھی ہوں۔"

میری برین واشنگ کے لئے اس نے بڑا بھرپور حملہ کیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو میں ڈگمگایا لیکن پھر سنبھل گیا۔ اب میں کسی نئے جال میں پھنسنے کو تیار نہیں تھا اور دوسری صورت میں بھی مجھے اپنے انجام کا علم تھا۔

"تم لوگوں نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے دوستو"

میں نے مضبوط لہجے میں اسے مخاطب کیا خدا شاہد ہے اس لمحے موت کے منہ میں بیٹھ کر یہ فقرہ کسی نادیدہ ہستی نے ہی میری زبان سے اگلوا دیا تھا۔

میں نے بخوبی دیکھ لیا تھا کہ چند منٹ میں میری تکا بوٹی کر ڈالیں گے لیکن میری حس بتا رہی تھی کہ میری حالت سے میرے اپنے گروہ کے لوگ بے خبر نہیں۔

شاید میری نگرانی ہو رہی ہو۔

شاید یہ بھی کوئی امتحان ہو؟

"جہنم میں جاؤ..... اگر تم نے مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کروں۔"

اس نے چاقو بردار کو اپنا کام جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

.....☆☆☆.....

اس وحشی کو جیسے مدتوں بعد ایسی خوراک نظر آئی تھی اور وہ بڑے خوفناک ارادے سے میری طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ جب کہ اس کا ساتھی کچھ فاصلے پر پستول تانے کھڑا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن۔ اف خدایا! دھڑکنوں کا تو شمار ہی مشکل تھا۔ خوف سے میری آنکھیں پھٹ جانے کو تھیں۔ اس سے پہلے موت کو اتنا قریب میں نے دیکھا کب تھا۔ میرا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر گرنے کو تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور قوت گویائی سلب ہوتی محسوس ہوتی تھی میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا میری سمت بڑھ رہا تھا۔

بالآخر میری پشت دیوار سے لگ گئی۔ اب تو پسپائی کا راستہ بھی باقی نہیں رہا تھا میں سہم کر رہ گیا اسی لمحے شاید میری ماں کی کوئی دعا کام آ گئی۔

اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔

امید کی کرن پیدا ہوئی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ دونوں نے حیرانگی سے دروازے کی طرف دیکھا اور وہی ایک لمحہ میرے کام آ گیا۔

زندہ رہنے کی امنگ تھی یا پھر موت کا خوف نجانے کس جذبے نے اچانک میری رگ رگ میں بجلیاں دوڑا دی تھیں۔ میں نے قریب پڑی میز کو دور سے ٹھوکر ماری وہ چاقو بردار کی ٹانگوں میں لگی جو پستول والے پر گر پڑا۔ پستول اس کے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر آ رہا۔

بجلی کی سی پھرتی سے لپک کر میں نے پستول اٹھا لیا۔ زمین پر پڑے چاقو کو میں نے ٹھوکر مار کر پرے کر دیا۔

دونوں خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہے تھے انہیں اتنے شدید ردعمل کی توقع تھی کب جس کا مظاہرہ میں نے کیا تھا۔ اسی لمحے ان کی آنکھوں میں ناچتی حیرت کی پرچھائیاں میں بخوبی

دیکھ سکتا تھا۔

میں نے بڑے اعتماد سے ان کو پستول سے کور کرتے ہوئے ایک کونے میں کھڑا ہونے کا حکم دیا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کیونکہ دستک دینے کے انداز نے مجھے بتا دیا تھا کہ آنے والا میرا ساتھی ہے۔

نووارد میرا ہی ہم عمر لگتا تھا لیکن اپنے قد کاٹھ اور جسم کی ساخت کے اعتبار سے وہ مجھ سے پانچ پر بھی بھاری پڑتا۔

اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

''معاف کرنا دوست! مجھے دیر ہوگئی ورنہ تمہیں اتنی زحمت بھی نہ کرنا پڑتی۔''

اس نے معذرت کی۔

ایسے گدھوں سے تو میں اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ الگ بات کہ ابھی تک دل کی دھڑکن نارمل نہیں ہوئی تھی۔

دونوں اجنبیوں کے چہرے غصے کے مارے سرخ ہو رہے تھے ان کا بس چلتا تو مجھے کچا چبا ڈالتے۔

وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے رہے۔ انہیں غصہ یقیناً اپنی بے بسی اور بیوقوفی پر آ رہا تھا۔

''دیوار کی طرف منہ کر کے ہاتھ اوپر کرو۔''

میرے ساتھی نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے ان سے کہا اور دونوں کو اس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

''تمہیں راستہ معلوم کرنا ہے نا! یہ ہے سیدھا راستہ''

اتنا کہہ کر میرے ساتھی نے جوان کے قریب پہنچ چکا تھا دونوں کے سروں پر بڑی پھرتی کے ساتھ پستول کا دستہ آزما دیا۔ اور دونوں چکرا کر گر پڑے۔ یہ حملہ ان کے لئے ناگہانی ثابت ہوا تھا۔

ان کے سروں سے خون جاری تھا۔ شاید دونوں بے ہوش ہو چکے تھے میرے ساتھی نے

میری مدد سے دونوں کو گھسیٹ کر غسل خانے میں ٹھونسا۔

اس نے کمرے کے فون پر منیجر کو اوپر بلایا۔ جو دو منٹ بعد ہی میرے ساتھی کے سامنے مؤدب کھڑا تھا۔

''ہم لوگ کمرہ اسی وقت چھوڑ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے سر''

منیجر نے تابعداری سے کہا۔

''دو مہمان تمہارے یہاں موجود ہیں ان کو سنبھال لینا۔''

''اوکے سر''

منیجر نے دوبارہ قریباً جھکتے ہوئے کہا۔

.....☆☆☆.....

کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے میرا سامان جو صرف ایک بریف کیس پر مشتمل تھا اٹھا لیا۔

مجھے قدم قدم پر اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ میرا گروہ لامحدود ذرائع کا مالک ہے اور ملک کے گوشے گوشے میں ان کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ہوٹل جس میں، میں نے قیام کیا تھا کوئی معمولی ہوٹل نہیں تھا۔ اس کا شمار ملک کے درجہ اول کے ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔

یہاں کا منیجر ان کا آدمی تھا۔ اب تو مجھے یقین ہو چلا تھا جیسے اس ملک میں کم از کم کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور جب جرم کرتے ہوئے خوف کا احساس بھی نہ رہے تو کمزور آدمی بھی دلیری پر اتر آتا ہے۔

.....☆☆☆.....

میں اپنے دوست کے ساتھ کار میں بیٹھ کر ایک شاندار بستی میں پہنچا وہ اسی کار میں ہوٹل آیا تھا۔ ایسی بستیاں بڑے بڑے شہروں میں عموماً بڑے لوگوں کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ میرا کام بھی کوئی چھوٹا تو نہیں تھا۔

ہم نے وہ رات ایک بنگلے میں گزاری۔ رات کو اندھیرا ہونے کی وجہ سے میں اس کا نمبر بھی نہ دیکھ سکا اور پھر پہلے ہی دن سے یہ اصول میں نے اپنا لیا تھا کہ مجھے کبھی کسی غیر ضروری کام میں حصہ نہیں لینا صرف اپنے کام سے مطلب رکھنا ہے زندگی اپنی تمام تر آسائشوں کے ساتھ یہاں موجود تھی۔

حسب روایت یہاں عورت اور شراب کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن میرے ہمراہی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں ان دونوں خرافات سے کوئی بھی نسبت قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

میری اس عادت کا علم میرے شہر کے لوگوں کو تو تھا لیکن ان کے لیے میں بہر حال نیا آدمی تھا اور جس گھناؤنی دنیا سے میرا تعلق قائم ہو چکا تھا اس کے کسی مکین سے اس نوعیت کی شرافت کی توقع جس کا مظاہرہ میں کر رہا تھا، عبث تھی۔

''نیا ہے بے چارہ..... دیکھیں گے صوفی کو واسطہ تو پڑتا ہی رہے گا.....''

میں نے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں سے ایک شخص کو پہلی مرتبہ نظریں اٹھا کر دیکھا۔ چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد گندمی رنگ سب اسے استاد کہہ کر مخاطب کر رہے تھے غالباً وہ وہاں موجود لوگوں میں سب سے سینئر تھا۔

ساری رات ہنگامہ ناؤ نوش برپا رہا۔ ان دنوں وی سی آر کی وبا اتنی عام نہیں ہوئی تھی لیکن یہاں وی سی آر پر ایک فحش فلم چل رہی تھی اور کمرے میں موجود عورتوں اور مردوں کے شیطانی قہقہے اور شراب کی بو کے بھبھو کے میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

میں نے اپنے ہمراہی سے یہاں مزید وقت نہ گزارنے پر معذرت کی اور اس کے ساتھ اسی بنگلے کے بیڈ روم میں چلا آیا کھانا میں نے اسی بیڈ روم میں منگوالیا پھر لمبی تان کر سو رہا۔

صبح جب بیدار ہوا تو میرا رات والا ساتھی میرا منتظر تھا۔ ناشتہ ہم نے اکٹھے ہی کیا پھر علاقہ غیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے پٹھانوں کا مقامی لباس زیب تن کر رکھا تھا اور جب تک میں زبان بند رکھتا کوئی مجھ پر پٹھان نہ ہونے کا شک نہیں کر سکتا تھا۔

''ویسے تو خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ اگر ہمیں

پوچھ گچھ کے لیے روکا جائے تو تم گونگے بن جانا۔''

میرے ساتھی نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور جواب میں میں بھی مسکرایا۔

.....☆☆☆.....

میرا ساتھی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر کا بیٹا تھا اور اس کی سرگرمیوں سے واقف ہونے کے باوجود کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

مجھے اس کی اصلیت کا علم رات ہی کو دوران گفتگو ڈرائنگ روم میں ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے جتلانا مناسب نہ سمجھا اگر اس نے خود اپنا تعارف اس حوالے سے نہیں کروایا تھا تو مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں بھی خاموش رہوں ہمیں راستے میں صرف ایک چیک پوسٹ پر روکا گیا۔ لیکن وہاں موجود محکمے کے ایک دو آدمیوں نے جیسے ہی میرے ساتھی کو پہچانا۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔

دوپہر کے بعد ہم علاقہ غیر میں ایک قلعہ نما مکان کے باہر کھڑے تھے۔ جہاں ایک ملک نے ہمارا استقبال کیا۔ میرے دوست نے پشتو میں کچھ کہہ کر میرا تعارف کروایا۔ جواب میں اس نے اتنی زور سے میرے کندھے پر ہنستے ہوئے ہاتھ مارا کہ میں ان کا تعارف حاصل کرنے کے طریقے کو واپس پہنچنے تک گالیاں دیتا رہا۔

ہم لوگ دیر گئے تک وہاں رہے یہیں ہماری ملاقات اس ٹرک ڈرائیور سے اور اس کے ساتھی سے کروائی گئی جس کے ہمراہ ٹرک پر مجھے پنجاب جانا تھا۔ واپسی پر میرے ساتھی نے اپنی سیٹ کے نیچے دو سٹین گن رکھی تھیں۔ جن میں سے ایک یقیناً میرے لیے تھی اسے خطرہ کسی قانونی ادارے سے نہیں بلکہ اپنے اور مادام نادرہ کے گروہ کے دشمنوں سے تھا ہم نے کل ان کے دو آدمیوں کی جو درگت بنائی اس کے بعد دوسرے گروہ سے بدلے کی امید نہ رکھنا جہالت تھی۔

یہ لوگ تو ویسے بھی انتقام کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی روایت پسند تھے اور جب تک بدلہ نہ لے لیں آرام سے بیٹھتے ہی نہیں تھے۔

شام کو ٹرک مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ مجھے یہ علم نہیں تھا اس میں کس قسم کا مال ہے جو لے کر

مجھے پنجاب جانا تھا لیکن بادی النظر میں وہ فرد ٹ سے بھرا ہوا ٹرک دکھائی دیتا تھا۔ اس کے نیچے کیا ہے؟ اس کا علم ماسوائے خدا کی ذات کے اور کسی کو نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ٹرک چلانے والوں کو بھی نہیں۔

انہیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ مال کو جان ہتھیلی پر رکھ کر محفوظ مقام تک پہنچاؤ ٹرک کسی کا تھا، مال لوڈ کرنے والے دوسرے لوگ تھے، ڈرائیور کوئی اور۔

کوئی ایک دوسرے سے واقف نہیں تھا میں دل ہی دل میں ان لوگوں کو ہرادا پر داد دے رہا تھا کتنا خفیہ اور محفوظ طریقہ اپنائے ہوئے تھے۔ اگر مخبری نہ ہو چکی ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص ٹرک پر لدی ہوئی لکڑی کی سینکڑوں پیٹیوں کو کھول کر دیکھتا پھرے کہ ان میں کیا ہے۔

رات کے دس بجے کے بعد ہم روانہ ہوئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دسمبر کی سردیاں پورے شباب پر تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ میرا بریف کیس رکھا تھا اور قدموں میں بھری ہوئی سٹین گن میں نے اپنے اوپر ایک بڑا سا کمبل اوڑھ رکھا تھا اور ٹرک کی آرام دہ سیٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ڈرائیور شکل ہی سے کوئی چھٹا ہوا بدمعاش دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے بڑی عزت سے پیش آیا۔

.....☆☆☆.....

ابھی ہم بمشکل دس پندرہ میل ہی شہر سے باہر نکلے تھے کہ ایک جگہ سڑک کے کنارے بنی ایک چونگی پر ڈرائیور نے اچانک ٹرک روک لیا اور غریب سا مقامی شخص ڈرائیور کے پاس آیا جو میرے ساتھ بیٹھا چرس سے بھرے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اس نے پشتو میں کچھ کہا۔ مجھے اب تھوڑی بہت سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ کوئی سرکاری کارندہ تھا۔ لیکن ہمارے گروہ کے لیے مخبری کا کام کرتا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے شک ظاہر کیا تھا کہ ہماری مخبری ہو چکی ہے لیکن ڈرائیور نے جواب میں اسے ڈانٹ پلا دی۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ راولپنڈی تک کسی بھی جگہ کوئی اس کو گرفتار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

وہ شخص جو چونگی کا ہی ملازم دکھائی دیتا تھا، اپنا فرض پورا کر کے واپس چلا گیا۔ جب

ٹرک وہاں سے روانہ ہوا تو میں نے ڈرائیور سے اس کے بارے میں پوچھا۔

''اپنا آدمی ہے صاحب ذرا چرسی سا ہے زیادہ چڑھ گئی ہوگی۔ کہہ رہا تھا کہ اسے مخبری ہونے کا شک ہے۔''

''اگر تمہارے پاس کوئی بھی تصدیق کا ذریعہ ہے تو خبر کی تصدیق کر لو۔ ہو سکتا ہے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔''

میں نے ڈرائیور سے اپنے شک کا اظہار کیا۔ ہوٹل کے ہنگامے کے بعد مجھے اس بات کا ثبوت تو مل ہی چکا تھا کہ کوئی مخالف پارٹی ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں کو ہمارے بارے میں تمام معلومات حاصل ہو گئی ہوں۔

''واہ بابو جی! آپ تو پنجابی ہی نکلا۔''

ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں مسکرا کر چپ ہو رہا۔ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔

ہم نوشہرہ سے ابھی کافی پیچھے ہی تھے کہ سڑک کے عین درمیان ایک ڈرم پر سرخ لالٹین جلتی نظر آئی۔

''خطرہ''

میرے ذہن نے چیخ کر رہنمائی کی۔

''ہوشیاری سے بابو! روکوں گا نہیں، سیدھا نکلوں گا۔''

ڈرائیور نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

میں نے سٹین گن گود میں رکھ لی۔ ایک شخص سڑک کے کنارے سرخ جھنڈی ہلا کر ہمیں ٹھہرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جب کہ سبز رنگ کی ایک جیپ بھی وہاں نظر آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے گیئر بدلا اور اب ہمارا ٹرک پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ اس نے سائیڈ بمپر مار کر ڈرم اور لالٹین کو پرے پھینک دیا۔

اس کے ساتھ ہی ٹرک کے پچھلے حصے سے سٹین گن چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہمارے پچھلے ساتھی نے روکنے والوں پر فائرنگ شروع کردی تھی۔ وہ ان کی اس جیپ کو نشانہ بنا رہا تھا جو ہمارے تعاقب میں آنے والی تھی۔ لیکن سرکاری عملہ ہم سے بھی زیادہ ہوشیار نکلا انہوں نے پہلے ہی خود کو اس صورت حال کے لیے تیار کر رکھا تھا وہ بالکل نہیں گھبرایا ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے یہ ان کے لیے بچوں کا کھیل ہو۔

نوشہرہ تک یہ آنکھ مچولی جاری رہی جیسے ہی ہم نوشہرہ کی پہلی چونگی پر پہنچے سڑک کے کنارے پہلے سے ایک جیپ ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی۔ غالباً ان لوگوں نے وائرلیس کے ذریعے اطلاع دے دی تھی۔ ڈرائیور اس صورتحال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا جیپ اچانک سڑک کے ایک کنارے سے برآمد ہوئی اور ہم پر فائرنگ شروع ہوگئی۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس صورتحال اور دوبارہ اچانک آپڑنے والی بپتا نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس گھیرے سے زندہ سلامت کیسے نکل سکوں گا۔

اسی لمحے مجھے بڑی شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہوا نجانے صوبہ سرحد کے اس ہوٹل میں جب اچانک دو درندے مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے تب ان احساسات سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑا شاید انسانی سائیکی میں کچھ ایسے لمحات ضرور آتے ہیں جب وہ اچانک ایک فیصلہ کرے اس پر عمل بھی کر گزرتا ہے۔ ان لمحات میں مجھ ایسے کمزور انسان بھی طاقتور بن جاتے ہیں۔

تب میں نے یہی سوچا کہ اب زندہ بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ جیپ میں موجود لوگوں کو اطلاع مل گئی تھی کہ ہم پولیس پر فائرنگ کر رہے ہیں اور اب یہ لوگ ہمیں روکیں نہیں بلکہ گولی ماریں گے میں نے سوچا اس طرح کتے کی موت مرجانے سے یہ بہتر نہیں کہ ایک مرتبہ صدق دل سے زندہ رہنے کی کوشش کر کے دیکھ لوں۔ ابھی اس کشمکش کا شکار تھا کیا کروں کیا نہ کروں۔

اچانک ٹرک کو ایک دھچکا لگا ٹائر میں گولی لگی ڈرائیور نے اچانک گیئر بدلا گولی لگنے اور گیئر بدلنے کا عمل شاید ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہوئے تھے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے ہینڈ

بریک کھینچی ہو۔

اسی ایک لمحے کا فائدہ میں نے اٹھایا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا اور بریف کیس سمیت سڑک کے کنارے چھلانگ لگادی۔

خدا کا شکر ہے کہ کچی زمین پر گرا اور ٹرک کی رفتار بھی بہت کم تھی ورنہ تو میری ہڈی پسلی برابر ہو چکی ہوتی۔

تعاقب میں آنے والوں کی توجہ یا تو ٹرک پر ہی تھی یا پھر ان لوگوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ ورنہ شاید وہ میری زندگی کا آخری جرم ہوتا۔ زمین سے اٹھتے ہی جس چیز نے سب سے پہلے میری توجہ اپنی طرف مبذول کی، وہ ایک دھماکے کی آواز تھی ان لوگوں نے فائرنگ کر کے ٹرک کے ٹائر پھاڑ دیئے تھے چاند کی مدھم اور سرکاری جیپ کی تیز روشنی میں ٹرک کی پچھلی بتیاں مجھے لرزتی دکھائی دینے لگیں۔ میں نے اس سمت نظریں گاڑ رکھی تھیں۔

ٹرک پہلے تو مست ہاتھی کی طرح جھومتا رہا پھر قریباً تیس چالیس گز دور جانے کے بعد الٹ گیا۔ میں نے آخری منظر یہ دیکھا دونوں جیپوں سے پولیس کے جوان کود ے اور انہوں نے گرے ہوئے ٹرک کو گھیرے میں لے لیا میری کمر میں کچھ چوٹ لگی تھی۔

لیکن اس وقت مجھے کوئی درد محسوس نہ ہوا جان بچانے کی دھن میں اس درد کا احساس دم توڑ چکا تھا۔ میں اٹھا اور بے تحاشا کھیتوں کے اندر ہی اندر بھاگنے لگا۔

.....☆☆☆.....

بھاگتے بھاگتے میں تھک چکا تھا اور میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ میں نے اندازاً دو میل کا فاصلہ کمر میں شدید تکلیف کے باوجود طے کر لیا تھا۔ شاید میں نے جس لمحے ٹرک سے چھلانگ لگائی تھی اس وقت ہمارا زاویہ ایسا ہوگا کہ تعاقب میں آنے والی جیپوں کو یہ احساس نہ ہو سکا کہ ٹرک سے کوئی باہر بھی کودا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا ورنہ کچھ لوگ ان میں سے میرے تعاقب میں ضرور آتے۔ میرے لیے یہ تائید غیبی تھی۔

مسلسل بھاگ دوڑ اور گرفتاری کے خوف نے مجھے خاصا نڈھال کر دیا تھا اندھیرے میں دور دور تک کوئی ذی ہوش دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ اب میرا ایک قدم من من کا ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود میں رکا نہیں چلتا رہا۔ میں جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہتا تھا چھوٹا بریف کیس ابھی میرے پاس تھا۔ خدا جانے چھلانگ لگاتے وقت بریف کیس میں نے کس طرح مضبوطی سے تھامے رکھا ابھی تک کھیتوں کے بیچوں بیچ یا پھر ان کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا دور سے ایک فیکٹری کے آثار بھی دکھائی دینے لگے لیکن میں نے اس طرف جانا مناسب نہیں سمجھا ایک کھیت کے کنارے لگے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا چند منٹ کے بعد ہی میں اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا میرا ذہن بڑی تیزی سے ساتھ پیش آمدہ حالات سے نمٹنے کے لیے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔

.....☆☆☆.....

جسمانی حالت نے ابھی تک میرے ذہن کو متاثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ جوں جوں میری جسمانی حالت ابتر ہو رہی تھی، ذہنی حالت مزید بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ جان بچانے کی خواہش تمام کمزوریوں پر غالب تھی۔

اس حالت میں میں ہرگز گرفتار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا پھر بریف کیس میں سے اپنے کپڑوں کا واحد جوڑا نکال کر پہن لیا۔

اب میں پتلون شرٹ اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ شلوار قمیص میں نے وہیں کھیتوں میں پھینک دی۔ جسم کے مختلف حصوں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں لیکن جان بچانے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ اس کے سامنے باقی تمام احساسات کو موت ہی آ گئی۔

ہاتھ سے بندھی گھڑی دیکھی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ سردی ہڈیوں میں گھسنے لگی تھی اور اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اپنا جسم گرم رکھنے کے لیے پیدل چلنا شروع کر دوں اس لمحے جب میں اوس میں بھیگتا زمین پر گھسٹ رہا تھا تو ایک لمحے کیلئے میں نے سوچا اگر میں تعاقب میں آنے والی جیپوں سے ہونے والی فائرنگ میں مر جاتا۔ کوئی گولی مجھے لگ جاتی۔

میرا کوئی عضو ہی ٹوٹ جاتا تو میری ماں پر کیا گزرتی شاید مرنے کے بعد میری لاش کو بھی لاوارث جان کر دفنا دیا جاتا۔ یہاں میری شناخت کرنے کون آتا اور میری ماں وہ تو زندگی کے آخری سانس تک شاید میرا انتظار کرتی رہتی.....

اسی تصور نے مجھے لرزا کر رکھ دیا میں نے اپنی سوچ کے دھارے کا رخ موڑنے کیلئے مادام نادرہ کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔

میں نے سوچا جلد یا بدیر پولیس کو اس بات کا علم ہو جائے گا کہ میں ٹرک سے فرار ہو چکا ہوں۔ اب سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ انہوں نے مجھے کہاں کہاں تلاش کرنا تھا۔ ظاہر ہے وہ نوشہرہ میں یا پھر نوشہرہ سے پنجاب کی طرف جانے والی سڑک پر ہی میرے لیے ناکے لگائیں گے۔

ایک بات سوچ کر میں دل کو تسلی بھی دے لیتا تھا کہ اس گروہ میں کم از کم آج تک ایسا ہوا تو نہیں کہ کسی گرفتار ہونے والے نے تفتیش کے بعد اپنے دوسرے ساتھی کا پتہ بتا دیا ہو۔ اول تو ہمارے مالکان یہ نوبت ہی نہیں آنے دیتے اور حالات پر پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی کنٹرول حاصل کر لیتے تھے پھر بھی مجھے حالات کے منفی پہلو پر ہی زیادہ نظر رکھنی تھی میں نے واپس پشاور لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے پاس کافی رقم تھی اور میں کسی بھی ذریعے سے وہاں سے واپس لاہور جا سکتا تھا۔

اندازے سے سڑک کی سمت چل پڑا۔ اور صبح پانچ بجے کے قریب میں سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں غالباً کوئی کارخانہ تھا جس کی نئی شفٹ شروع ہونے والی تھی۔ مجھ میں چلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی لیکن میں زندگی اور عزت بچانے کے لیے چلتا رہا۔ اب مجھے درد کے ساتھ ساتھ بخار کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک پشاور جانے والی بس کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ کنڈکٹر نے ایک لمحے کیلئے سرسری سی نظر کے ساتھ میرا جائزہ لیا پھر مجھے سڑک کے کنارے بنی ہوئی فیکٹری کا ہی کوئی افسر سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔ بس میں بیٹھتے ہی میں نے اونگھنا شروع کر دیا بخار اور درد کی شدت بے حال کیے دیتی تھی۔ لیکن میں اونگھتے اونگھتے ہی خدا خدا کر کے پشاور پہنچ گیا۔

مسز بھٹی کو اس عمر میں بھی عورت کم از کم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ حقیقت میں ایسی عورت تھی جو ساٹھ سال کی عمر میں بھی لڑکی نظر آئے۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر ہی رہی ہو گی لیکن یہ صرف میرا اندازہ تھا۔

''تمہاری طبیعت غالباً کچھ خراب ہے۔''

میک اپ سے اٹے چہرے والی مسز بھٹی نے میرے سامنے بڑی تکلفی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی، جی، جی نہیں۔''

میرے منہ سے بمشکل نکلا۔ نجانے اس سے بات کرتے ہوئے میں کیوں گھبرانے لگا تھا۔

''گھبراؤ نہیں اب تمام مصیبت ختم ہو گئی ہے۔''

اس نے مجھے بظاہر حوصلہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور مسکراتے ہوئے اس نے میرا بھرپور جائزہ لیا شاید مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں تول رہی ہو۔

''جی شکریہ۔''

میں نے سنبھل کر کہا۔

مسز بھٹی نے فون پر غالباً کسی ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ پھر ڈاکٹر اور ناشتے کی آمد ایک ساتھ ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر کی ہدایت پر ابلے ہوئے انڈے کھائے۔ دودھ پیا۔ اس نے مجھے انجکشن لگایا کچھ دوائیاں لکھ کر ایک کاغذ مسز بھٹی کو تھما دیا۔ جو مجھے سہارا دے کر ایک خوبصورت بیڈ روم میں

لے گئی۔

شاید آرام اور درد سے نجات پانے کے لیے مسکن ادویات دی گئی تھیں۔ میرے ذہن میں دور دور تک کہیں رات کے واقعات کی پرچھائیاں بھی موجود نہیں تھیں۔ بڑی شاندار ''سائیکو تھراپی'' مجھے مسز بھٹی نے مہیا کی تھی۔

بستر تک میں غنودگی کے عالم میں پہنچا تھا۔ صرف ایک مسز بھٹی کے قرب کا احساس تھا جس نے میری نس نس میں چیونٹیاں سی بھر دی تھیں۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ میں نے وہاں پہلے سے موجود کپڑے بدلے اور بے سدھ ہو کر پلنگ پر گر پڑا۔ کمرہ کافی گرم تھا۔

تھوڑی دیر بعد مسز بھٹی دوبارہ اندر آئی۔ اس نے مجھے ایک کیپسول اور دوائی کی خوراک پلائی۔ مجھ پر کمبل ڈال دیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو گیا۔

خواب میں ٹرک اور فائرنگ کے مناظر بار بار میری قوت برداشت کا امتحان لیتے رہے۔ قریباً ڈھائی تین بجے تک میں گہری نیند سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ درد اور بخار غائب تھے۔ صرف کمر میں ہلکے ہلکے درد کا احساس باقی تھا۔ میں نے کمبل ایک طرف پھینکا ایک زوردار انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جانے کسی جادو اثر دوائی یا پھر مسیحائی کا کمال تھا کہ میں خود کو دوبارہ چاک و چوبند محسوس کرنے لگا پھر ملحقہ باتھ روم کا راستہ لیا۔

جب میں غسل خانے سے برآمد ہوا تو مسز بھٹی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے کو سہلاتے ہوئے میری خیریت دریافت کی۔

اسی کی زبانی معلوم ہوا کہ مسز نادرہ نے دو مرتبہ فون کیا اور میری خیریت دریافت کی تھی۔ اس نے مسز بھٹی کو ہدایت کی تھی کہ جب میں نیند سے بیدار ہو جاؤں تو فون پر وہ مسز نادرہ سے میری بات کروا دے۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں براہ راست ڈائلنگ پر مسز نادرہ سے مخاطب تھا میں نے اشاراتی زبان میں اسے تمام واقعات سے آگاہ کیا اس نے مجھے شاباش دی۔ میری بہادری کی تعریف کی اور مجھے اگلے حکم تک وہیں انتظار کرنے کی ہدایت کی۔

میں نے اس سے اپنے گھر کی خیریت دریافت کی تو مسز نادرہ نے بتایا کہ اس کی میرے گھر پر مکمل نظر ہے اگر میرے ذہن میں دور دور تک اس سلسلے میں کوئی تشویش ہے تو میں اسے نکال پھینکوں۔

ایک مرتبہ پھر اس نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میری ایک خاص انداز سے تعریف کرنے کے بعد کہا کہ فون مسز بھٹی کو دے دوں۔

مسز بھٹی سے جب وہ فون پر بات کر رہی تھی تو میں نے مسز بھٹی کو صرف ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتے ہوئے اور اپنی طرف اسے کن انکھیوں سے گھورتے پایا۔

فون کریڈل پر رکھتے ہوئے اس کی مسکراہٹ بہت گہری ہو چکی تھی۔

اس نے فون رکھنے کے بعد قریباً ہنستے ہوئے مجھے کہا۔

''مسز نادرہ نے تمہارا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کی ہے۔.....''

میں سوائے سر جھکا کر مسکرانے کے اور اس بات کا کیا جواب دیتا۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی میں نے بھوک کی شکایت کی تھی مسز بھٹی باہر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹرالی گھسیٹتی ہوئی جب دوبارہ اندر داخل ہوئی تو اس کے بدن سے اٹھنے والی ایک خاص خوشبو کی لپٹوں نے جیسے میرے ذہن کو مسخر کر لیا۔

خدا جانے اس خوشبو میں کیا جادو بھرا تھا مجھے اپنے خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہونے لگی۔ شاید اس خوشبو کا استعمال ہی یہی تھا۔

ٹرالی پر اس نے میرے لیے کھانا سجا رکھا تھا۔ میرے سامنے بیٹھ کر اس نے میرے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا..... خوشبو کا خمار بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ مجھے وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ خوبصورت اور جوان نظر آ رہی تھی۔

مسز نادرہ نے مجھ پر آخری اور بھرپور حملہ کرنے کی تیاری کر لی تھی۔ اس نے اس مرتبہ اپنے ترکش کا سب سے شاندار تیر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایسا تیر جس کا نشانہ کبھی نہ چوکے..... شاید اس کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ میں پے در پے پیش آنے والے واقعات

سے بددل ہو کر ''بغاوت'' نہ کر جاؤں..... مسز بھٹی جیسی جہنمی بلیاں اس نے میرے جیسے مضبوط شکار کو مارنے کے لیے ہی پال رکھی تھیں۔

اس کا خاوند جو کوئی افسر تھا غالباً کسی دورے پر گیا ہوا تھا گھر میں اس کے علاوہ تین نوکر تھے اور میں۔

.....☆☆☆.....

میں بہرحال گوشت پوست کا انسان تھا۔ نوجوان تھا۔ میرے جذبات تھے اور بھٹک جانے والی عمر میں قدم رکھ چکا تھا۔ میری پارسائی کہاں تک میرا ساتھ دیتی۔ ایسے ماحول میں اپنے آپ کو کہاں تک بہکنے بھٹکنے سے روک سکتا تھا اتنی آسائش ایسا آرام اور مسز بھٹی جیسی خوبصورت عورت کی صحبت کے سامنے میری پاکیزگی کہاں تک سدراہ بنی رہتی۔ اس کی ایک ایک ادا سراپا دعوت تھی اور ستم بالائے ستم کہ مجھے رات اس کے پاس بسر کرنا تھی۔

رات آئی اور میری سیاہ کاریوں کا ایک نیا باب رقم کر گئی۔ اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے حقیقتاً اپنے گناہ گار ہونے کا احساس ہوا۔ لیکن گناہ کی لذت نے احساس گناہ کو ختم کر ڈالا۔

ضمیر نے ملامت تو کی لیکن اس کی شدت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ روحانی گھاؤ گو کہ بہت گہرا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ میں نے اس حادثے کو بہت شدت سے محسوس نہ کیا..... انسان سمجھوتہ کرنے پر آئے تو ایسے حالات سے بھی سمجھوتہ کر لیا کرتا ہے.....

صبح میں بیدار ہوا، نہا دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو ایک ملازم نے کسی خاتون کی آمد کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد میں حیرانگی کے ساتھ مسز نادرہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایک خوبصورت سیکرٹری نے اس کا بریف کیس تھام رکھا تھا اور مسز بھٹی اس کے پیچھے پیچھے اس طرح چلتی آ رہی تھی جیسے وہ اس کی زرخرید غلام ہو۔

اس کے چہرے کی تمکنت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی جو حادثہ ابھی تک میرے اعصاب پر سوار تھا..... ایسے حادثات شاید مسز نادرہ کے لیے معمولی حیثیت بھی نہیں رکھتے تھے۔

اس کی طرف ایک نظر دیکھنے سے مجھے یہی احساس ہوا جیسے اسے اس بات کی قطعاً پرواہ

نہیں کہ ٹرک اور اس کے کارندے پولیس کے حراست میں ہیں۔

وہ شاید پہلی فلائٹ سے یہاں چلی آئی تھی۔

مسز بھٹی سے نظریں ملانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی لیکن جب بھی ہماری آنکھیں آپس میں ٹکرائیں ایک فتح مندانہ مسکراہٹ میں نے اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی پائی۔

واقعی اس نے میدان مار لیا تھا۔

شاید اس نے مسز نادرہ کو اپنے اس ''کارنامے'' سے آگاہ بھی کر دیا تھا..... کیونکہ میری خیریت دریافت کرتے ہوئے اس نے ایک ذومعنی سے فقرے کے ساتھ میری طرف جو مسکراہٹ اچھالی تھی اس سے میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ اس معرکے کو سر کرنے پر مسز نادرہ کتنی خوش ہے۔

انسان اس حد تک بھی گر سکتا ہے؟

اس نوعیت کے کئی سوالات تب میرے ذہن میں بھی پیدا ہوئے تھے۔ میں نے بڑے دکھ سے یہ سوچا تھا کہ میری ماں کی تربیت اس کا روزانہ مجھ پر ہونے والا دم درود بس ایک ہی جھونکے میں ہوا ہو گیا؟

مجھے اپنی اس حالت پر ہنسی بھی آتی تھی اور رحم بھی آتا تھا۔

.....☆☆☆.....

میں مسز نادرہ کی اچانک آمد سے واقعی حیران رہ گیا تھا یوں تو اس کی ہر ادا چونکا دینے والی ہوتی تھی لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اپنی اتنی بے تحاشہ مصروفیت کو تج کر یہاں چلی آئے گی۔ بعد میں علم ہوا کہ جب معاملہ کسی طرح ''بڑوں'' میں سے کسی کے قابو نہ آئے تو پھر مسز نادرہ کو خود کنٹرول سنبھالنا پڑتا ہے۔

پولیس ایک عرصے سے ہمارے مقامی باس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت چاہتی تھی، جو اس کو مل چکا تھا۔ گو پولیس والے اب تک گرفتار شدگان میں سے کسی کی زبان سے ایک لفظ اپنے مطلب کا حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، لیکن حقیقت اپنی جگہ تھی کہ وہ بہرحال ہمارا ٹرک تھا۔

ہمارا مخالف گروہ انتہائی کمینگی پر اتر آیا تھا وہ لوگ پولیس کو ہمارے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے تمام مواقع فراہم کر رہے تھے۔

مجھے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ پولیس ان دونوں نوجوانوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہی تھی جنہوں نے ایک شاندار ہوٹل میں غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو مسافروں کو پستول کی زد میں اپنے کمرے میں لا کر ان پر پہلے تشدد کیا اور پھر بے ہوش کر کے ان سے بتیس ہزار روپیہ چھین کر فرار ہو گئے۔

ہمارے مخالف گروہ نے ظاہر ہے ہمارے خلاف یہی رپورٹ لکھانی تھی یہ لوگ بسا اوقات ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایسی ہی حرکتیں کر گزرتے ہیں جو عام شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

اپنے آدمیوں کے ذریعے اپنا ہی مال پکڑوا کر دوسرے گروہ کو پکڑانے کی چال چلی جاتی تھی..... اگر اپنے آدمی پر ''ڈبل کراس'' ہونے کا شبہ گزرتا تو اسے ایسی پلاننگ سے قتل کیا جاتا کہ مخالف گروہ پھنس جائے.....

یہ لوگ عموماً بڑے بڑے افسروں کو اپنے جال میں پھانسنے کے چکر میں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی آپس میں دوڑ لگی رہتی تھی۔ ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی ''پشت پناہی'' کرنے والے افسروں کو پھنسا دیا کرتے تھے تاکہ مخالف کی قوت کو کمزور کیا جائے۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ ان تمام کارروائیوں کی عوام الناس یا عام حکومتی عمال کو ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی تھی۔ بس ان لوگوں کو ہی علم ہوتا تھا جو اس کیس میں شامل ہوتے تھے۔

مخالف گروہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ میرا اور میرے دوسرے ساتھی کا حلیہ بھی لکھوایا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی کو تو پولیس نے اسی روز رات کے وقت گرفتار کر کے صبح رہا بھی کر دیا تھا..... اسے اس سے زیادہ حراست میں رکھا بھی نہیں جا سکتا تھا..... اس کے ہاتھ کتنے لمبے تھے اس کا اندازہ مجھے ہو چکا تھا.....

اس شخص کی وقتی گرفتاری بھی دوسرے گروہ کے بے پناہ دباؤ کی وجہ سے عمل میں آئی

تھی..... لیکن صبح کے اخبارات میں یہ خبر بڑی نمایاں شائع ہوئی تھی کہ فلاں اعلیٰ شخصیت کے صاحبزادے کو پولیس نے ڈاکہ زنی کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے..... یہ خبر جس طرح بم بن کر ہمارے گروہ کے لوگوں پر پڑی اس کا اندازہ مجھے ہوگیا تھا۔

بڑے سائنٹفک طریقے سے یہ لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے تھے۔ راتوں رات مخالف گروہ نے پریس میں ''اپنے بندے'' سے رابطہ کر کے یہ خبر بھی لگوادی تھی بعد میں یہ بات اتنی بڑھی کہ اس معاملے کو اس طرح اچھالا گیا کہ اس ''اعلیٰ شخصیت'' کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا یہی ان لوگوں کا مقصود تھا اس طرح انہوں نے یہاں مسز نادرہ کے گروہ کا ایک آہنی ستون گرادیا۔

.....☆☆☆.....

''کیسے ہو اب؟''

مسز نادرہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگئی۔

''جی ٹھیک ہوں۔''

میں نے کھسیانے ہو کر اس طرح جواب دیا جیسے کسی نے میری چوری پکڑلی ہو۔

''کیا بات ہے کسی نے تنگ تو نہیں کیا۔''

اس نے مسز بھٹی کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

دونوں جہاندیدہ عورتیں مجھے کھلونا سمجھ کر میرے ساتھ اپنا جی بہلا رہی تھیں۔ ان کے دل چہروں کے برعکس کتنے مکروہ تھے یہ میں ہی جان سکتا تھا۔

''جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

مجھے اس طرح شرم آرہی تھی۔ جیسے میں کوئی پردہ دار عورت ہوں۔

مسز نادرہ نے یہ کارنامہ انجام دینے پر مسز بھٹی کو داد دی ہوگی کیونکہ یہ سب کچھ اس کے لیے بہرحال ضروری تھا جب تک مجھ میں شرافت یا نیکی کے تھوڑے سے جراثیم بھی باقی رہتے وہ لوگ مجھ سے خطرہ محسوس کر سکتے تھے۔ کسی بھی وقت کسی بھی لمحے میں ان کے لیے نقصان دہ ثابت

ہوسکتا تھا۔

اپنے کسی بھی کارکن کے دماغ میں موجود نیکی اور شرافت کے کیڑے ختم کرنا ان کی ڈیوٹی کا گویا حصہ تھا۔ مسز نادرہ کے لیے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ میں آہستہ آہستہ ''لائن'' پر آ رہا ہوں۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ ایک شاندار کار میں اپنے مشن پر روانہ ہوگئی اور مجھے پھر مسز بھٹی کے رحم وکرم پر چھوڑ گئی۔

''راشد!'' کسی بات سے گھبرانا یا شرمانا نہیں۔ تم میرے بہترین دوستوں میں سے ہو..... تمہاری کوئی خواہش تشنہ نہیں رہنی چاہیے۔ جس چیز کی ضرورت محسوس کرو اشارے کنائے سے اسے بتا دینا۔

اس نے جاتے جاتے رک کر بڑے گھمبیر لہجے میں مجھے خطاب کرتے ہوئے مسز بھٹی کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی یہی خواہش تھی کہ اگر میرے دل میں تھوڑا سا پچھتاوا بھی موجود ہے تو وہ بھی نکل جائے۔

''آؤ باہر لان میں بیٹھتے ہیں۔'' مسز بھٹی نے اس کے جاتے ہی بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر اپنے بازو کا بوجھ ڈالا۔

ہم دونوں لان میں چلے آئے۔ پھر وہ مجھے اپنی گیلری میں لے گئی۔ مسز بھٹی بھی کمال کی آرٹسٹ تھی۔ اس کی بنائی ہوئی تصاویر کی اکثر نمائش ہوتی رہتی تھی۔ اعلیٰ کچوئل طبقے میں اس کا ایک خاص مقام تھا۔ اس بات کا اندازہ میں نہ کر سکا کہ وہ بھی میری طرح اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی یا اسے یہاں آنے پر مجبور کیا گیا تھا..... وجہ کچھ بھی ہو اب اس کا شمار اس گروہ کے وی آئی پی میں ہوتا تھا۔

مسز نادرہ معمولی آدمی سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ مسز بھٹی کے ساتھ اس کی بے تکلفی مسز بھٹی کے ''مقام'' کا اندازہ لگانے کے لیے کافی تھی۔

.....☆☆☆.....

شام کا وقت میں نے جوں توں کر کے کاٹا۔ شام کو مسز نادرہ کی واپسی ایک ''معزز آدمی'' کے ساتھ ہوئی، پہلی نظر میں وہ شخص مجھے واقعی کوئی معزز دکھائی دیا۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس کے جوہر جب مجھ پر کھلنے لگے تو میں حیران رہ گیا کہ بظاہر ایک معزز اور انتہائی شریف نظر آنے والا یہ گورا چٹا لمبا تڑنگا شہری اندر سے کتنا سیاہ کار ہے۔

مجھے زندگی میں کئی خطرناک اور بدمعاش لوگوں سے واسطہ پڑا ہے لیکن اس جیسا مکار بدمعاش آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ اس کا طریق واردات اتنا خطرناک تھا کہ اس کا شکار کبھی بھی اس کے شکنجے سے نہ نکل پاتا۔

اعلیٰ سوسائٹی میں وہ مسٹر خان کے نام سے مشہور تھا۔ شہر میں کسی بھی پولیس افسر کے پاس اس کا نام استعمال کر کے ہی لوگ کئی کام کروالیا کرتے تھے بعد میں اس آفیسر کو جب معلوم ہوتا کہ کام کروانے والے سے مسز خان کا کوئی تعلق نہیں تو وہ سر پیٹ کر رہ جاتا۔ لیکن بے چارے میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ براہ راست مسٹر خان سے کوئی بات پوچھ سکے۔

''یہ شریف آدمی'' ایک شاندار ہوٹل کا مالک تھا اور اس ہوٹل میں شہر کے متمول طبقے کا ہی داخلہ ممکن تھا۔ ہوٹل اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کیلئے شہرت رکھتا تھا، لیکن کیا مجال جو کبھی کسی مقامی افسر نے وہاں مداخلت کی جرأت کی ہو۔

ہوٹل کی آڑ میں وہ بہت ہی خطرناک کاروبار کر رہا تھا۔ اصل میں اس کا ہوٹل ہی وہاں ہماری سرگرمیوں کا محور تھا۔ کوئی بھی سودے بازی کرنے کے لیے وہی ہماری بہترین قیام گاہ تھی۔

لیکن کسی نے بھی اس کے ذرائع آمدن کے متعلق تحقیق کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کا طریقہ واردات سن کر ہی شریف آدمی سہم جاتا تھا۔

جیسے ہی شہر میں کوئی اعلیٰ افسر آتا۔ اس کی تربیت یافتہ فاحشائیں اس سے مراسم قائم کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔ یہ معمولی قسم کی فاحشہ لڑکیاں نہیں تھیں بلکہ ملک کے متمول خاندانوں کی پڑھی لکھی تعلیم یافتہ تہذیب اور سوسائٹی میں اعلیٰ مقام کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ اسی لیے کسی کو ان پر شک کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہ لڑکیاں اس گروہ کے ہاتھ کیسے لگیں؟ یہ الگ کہانی ہے۔

بہر حال جیسے ہی کوئی نیا افسر آتا، ان میں سے کوئی مخصوص لڑکی اس سے راہ و رسم بڑھا لیتی۔ بعض خوش قسمت تو اس جہنمی وبال سے بچ جاتے۔ لیکن جن کا معاملہ کام و دہن کی تسکین تک پہنچ جاتا انہیں وہ لڑکی اسی ہوٹل کے پہلے سے مخصوص کمرے میں شب بسری کی دعوت دیا کرتی تھی۔

یہاں خفیہ مقامات میں سے کسی ایک مقام پر ایک مووی کیمرہ پہلے سے موجود ہوتا اور اس کی سیاہ کاریوں کی تمام جزئیات اپنے اندر سمو لیتا یا پھر اس ''حادثے'' کی تصاویر حاصل کر لی جاتیں۔ وہ لڑکی اس کے چند دنوں بعد غائب ہو جاتی کیونکہ اسے کسی دوسرے شہر سے اسی اہم فریضے کے لئے بلاوا آ جاتا۔ پھر گروہ کا کوئی آدمی اس آفیسر سے ملاقات کرتا اور اس کو ساری فلم یا تصاویر دکھائی جاتیں ان کی پہلے سے کئی کاپیاں تیار کر لی جاتی تھیں۔

فلم دکھانے کے بعد اس سے صرف ایک مطالبہ کیا جاتا کہ وہ ان کے ہر حکم کی بلا چوں و چراں تعمیل کرے۔ دوسری صورت میں اس کے لئے سوائے خودکشی کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہتا۔ پھر وہ بے چارہ اپنی نوکری کے دوران لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہتا۔

وہ اپنی جان بچانے کے لئے اگر تبادلہ کسی دوسرے شہر میں کرواتا تو یہاں بھی یہ لوگ پیر تسمہ پا کی طرح ہر وقت اس کے پر سوار رہتے۔ مجھے اپنے گروہ کے ایک رکن نے بتایا تھا کہ وہ ملک کے تین ایسے اعلیٰ آفیسروں کو جانتا ہے جنہوں نے ان ظالموں کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشی

کر لی تھی۔

اب مجھے اس بات کی اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ آخر وہ لوگ کس طرح کھلے بندوں اپنے ناجائز دھندے میں مصروف ہیں اور کیوں ملک بھر میں کہیں کسی کو بھی ان کا بال بیکا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

شام تک مسز نادرہ نے مسٹر خان کی مدد سے حالات کو کنٹرول کر لیا اور رات کی فلائٹ سے میں اس کے ساتھ واپس لاہور جا رہا تھا۔ مسز بھٹی کے چہرے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسے میرے اچانک واپس چلے جانے کا بہت دکھ ہوا ہے۔

.....☆☆☆.....

پی آئی اے کے شاندار جہاز میں جب میں مسز نادرہ کی معیت میں داخل ہوا تو میں خود کو کوئی مافوق الفطرت ہستی سمجھ رہا تھا۔ یہ میری زندگی کی پہلی فلائٹ تھی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں ہوائی جہاز میں سفر کر سکوں گا اور ہوائی جہاز کی بھی فسٹ کلاس میں اپنے ملک کی ایک امیر اور معزز ترین ہستی کے ساتھ محو سفر تھا۔ شاید اس ایئر ہوسٹس کو جہاز والوں نے صرف ہمارے لئے ہی مخصوص کر دیا تھا جو دوران سفر میری اور مسز نادرہ کی سیٹ کے قریب مؤدب کھڑی کسی نہ کسی حکم کی منتظر رہتی۔

زندگی ہر لمحے مجھے انسانی کم مائیگی اور دولت کا احساس دلا رہی تھی۔ یہ بات آہستہ آہستہ میرے دل میں گھر کر چکی تھی کہ ''دام بنائے کام''

اس تھوڑے عرصے میں ملک کی بڑی بڑی اعلیٰ اور معزز ہستیوں سے سامنا ہوا تھا۔ ان میں امراء، بزعم خویش سیاسی لیڈر، مذہبی لیڈر، پلیڈر، سوشل ورکر اور نجانے کون کون شامل تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو کسی معاشرے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا عوام کے سامنے اتنا شاندار امیج بنا ہوا تھا کہ اگر میں چیخ چیخ کر بھی ان کی سیاہ کاریاں لوگوں کو بتانا چاہتا تو شاید میرا کوئی اعتبار نہ کرتا اور مجھے پاگل قرار دے دیا جاتا۔ ان لوگوں میں ایسے ایسے بزعم خویش مشائخ بھی شامل تھے کہ جن کا مکمل نام ہی لینا بے ادبی سمجھا جائے وہ بڑی بڑی گدیوں کے مالک تھے۔

ان کے مریدوں کی تعداد سینکڑوں، ہزاروں تک جا پہنچی تھی۔ ان کے فیض عام کے چشمے اپنے ملک میں تو کیا بیرونی ممالک میں بھی جاری و ساری تھے، لیکن ان کا ایسا بھیانک روپ میں نے دیکھا کہ میں جو خود ایک سیاہ کار تھا، مجھے بھی ان کے گھٹیا اور ذلیل کارناموں پر شرم محسوس ہونے لگتی۔

یہ لوگ دن کے اجالے میں لوگوں کے لئے رحم کے فرشتے بنے ہوئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں شیطان بن جاتے تھے۔ میں ایسے کئی ستر ستر سالہ بوڑھوں سے واقف ہو چکا تھا۔ جن کے حرم کدوں میں سولہ سولہ سال کی معصوم بچیاں ان کی ہوس کاریوں کا سامان بہم پہنچاتی تھیں۔ وہ اپنے دور کے زمین کے ناخدا بنے ہوئے تھے۔ کوئی بھی گدھا اجڈ، جاہل اور لفنگا جب جس باعصمت اور ایسی پاک و صاف لڑکی جس کی پاکیزگی کی قسم فرشتے اٹھا سکیں پر لٹو ہو جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو مذہبیت کے لبادے میں چھپے ہوئے راسپوٹین سے نہیں بچا سکتی تھی۔

میں حیران رہ جاتا کہ آخر ایک پڑھی لکھی اعلیٰ کوالیفائیڈ اور اچھے بھلے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی کو کیا مصیبت آن پڑی ہے کہ وہ ایک ساٹھ سالہ بوڑھے دولت مند سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتی ہے؟ پھر اس کی مجبوری دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا۔

اس بے چاری کو اتنا مجبور کر دیا جاتا کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے مظالم پر آہ بھی نہ بھر سکے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کرے۔

ایسی سینکڑوں مجبور اور بے بس حوا زادیاں ان پیران تسمہ پا کے حرم کدوں میں آج بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دن رات اپنے مرنے کی دعائیں مانگ رہی ہوں گی۔

.....☆☆☆.....

مجھے ان تمام جرائم کے پس پردہ صرف اور صرف ایک ہی چیز نظر آتی تھی اور اس کا نام تھا ''دولت۔''

یہ لوگ اس لئے ہمارے ناخدا بنے بیٹھے تھے کہ ان کے پاس پیسہ تھا وہ اس پیسے سے قانون، شرافت، عزت، شہرت، ضمیر، بڑا نام، پارسائی اور کائنات کی ہر نعمت حاصل کر سکتے تھے۔

یہ تھے وہ احساسات جنہوں نے مجھے انسان سے درندہ بنا دیا۔ جنہوں نے تمام اخلاقی قدروں کو پامال کر کے میرے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد دولت کا حصول بنا ڈالا۔ میرے نزدیک نیکی اور گناہ کی اس کے علاوہ اور کوئی تمیز نہیں رہ گئی تھی کہ دنیا میں سب سے بڑی نیکی ہے دولت حاصل کرنا اور سب سے بڑا گناہ ہے غریب ہونا۔

میں نے جان لیا تھا کہ یہ دنیا کمزوروں کے لیے نہیں۔ یہاں ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ بھینس پر اس کا حق ہے جس کے پاس اسے ہانکنے کے لیے ''ڈنڈا'' موجود ہو۔

میں نے دیکھ لیا تھا۔ شرافت خواہ وہ ماں کے روپ میں ہی کیوں نہ ہو، خود اپنے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔

.....☆☆☆.....

دوران پرواز بیگم نادرہ میری بہادری کی تعریف کرتی آئی۔ میں دو مرتبہ پولیس کے شکنجے سے بچ نکلا تھا اور کسی بھی نئے آدمی کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں اس کی ہی نہیں گروہ کے تمام بڑوں کی نظر میں ایک باعزت مقام حاصل کر چکا تھا۔

جہاز لاہور ایئرپورٹ پر اترا تو ایک شاندار ایئر کنڈیشن کار ہمارے لیے موجود تھی۔ بیگم نادرہ مجھے لے کر سیدھی اپنی کوٹھی پر چلی آئی۔ اس نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ ڈالا تھا اور اس ٹوٹ پھوٹ کا فائدہ جی بھر کے اٹھایا۔

اگلے روز صبح کے وقت جب میں نے سردی سے دم توڑتی دنیا کے ایک باشندے نے فراہمی سامان تعیش سے سجے ایک گرم اور شاندار غسل خانے میں نہاتے ہوئے رات کے گزرے واقعات کے متعلق سوچا تو خود مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے رات اپنے شہر کی ایک معزز قابل احترام اور خوبصورت ترین ہستی کی خواب گاہ میں اس کے پہلو بہ پہلو بسر کی ہے۔

صبح بیگم نادرہ کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے پراسرار مسکراہٹ اس کے چہرے پر خاص طور سے دیکھی تھی۔ پہلے روز اس کے پاس جو مجبور اور مقہور نوجوان آیا تھا وہ پانی کے علاوہ اور کچھ لینے کا فن نہیں جانتا تھا..... اس نوجوان کو بیگم نادرہ نے بے تحاشا ''خیرات'' سے لوٹا اور اس کے

خون میں موجود احسان شناسی کے جذبے کو ایکسپلائٹ کر کے اس سے کام لیا۔

لیکن وہ اس سے آگے جانا چاہتی تھی۔

اسے ایسا طوطا چاہیے تھا جو پنجرے سے نکالنے پر بھی باہر نہ نکلے اور قید خانے کو آزادی پر فوقیت دے، مسز بھٹی کے ذریعے اس نے یہ معرکہ پہلے ہی سر کر لیا تھا لیکن آج وہ براہ راست میدان میں اتری تھی۔

وہ اپنی گرفت آکٹوپس کی طرح میرے دل و دماغ کے علاوہ میرے جسم پر بھی مضبوط کر رہی تھی۔ اس نے میرے گزشتہ کارناموں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں مستقبل میں اس کے لیے سونے کی کان ثابت ہو سکتا ہوں۔ اب مجھے اپنے ''جسمانی تقاضوں'' کا احساس بھی ہونے لگا۔

میں نے دل ہی دل میں اسے ایک اور مقام بھی دینا شروع کر دیا تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد اپنے بریف کیس میں ایک خاصی موٹی رقم لے کر میں اپنے گھر چلا گیا۔ جہاں میری ماں تھی، جوان بہن اور بھائی تھے اور ان کی خوشیاں تھیں۔

میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ شہر میں موجود اپنا مکان جو ہم نے گروی رکھا تھا واگزار کروالیا اور اپنی ماں اور بہن بھائی کے ساتھ شہر منتقل ہو گئے۔

اس منتقلی پر میری ماں نے ہلکا سا احتجاج بھی کیا لیکن مستقبل کی ضرورتوں اور تقاضوں کا احساس میں نے اسے اس انداز میں دلایا کہ بے چاری میری بات فوراً مان گئی پھر والد کی بھی یہی خواہش تھی کہ ہم اپنے آبائی مکان میں نہ رہیں۔

شاید وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اب اس علاقے کے لوگوں کو کیسے منہ دکھائیں گے، یا پھر ان کو یہ احساس تڑپاتا رہتا ہوگا کہ ان کے بچے اس علاقے کے لوگوں کا سامنا کیسے کرتے ہوں گے؟

جب جیل میں ملاقات پر میں نے والد کو بتایا کہ ہم نے اپنا شہر والا مکان گروی سے چھڑوا لیا ہے اور وہاں منتقل ہو گئے ہیں تو جہاں انہوں نے اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا وہاں ایک ہوک بھی ان کے کلیجے سے ضرور اٹھی تھی۔

آخر اس گھر سے بری بھلی جیسی بھی سہی ان کی یادیں وابستہ تھیں میں نے انہیں یقین

دلایا کہ ہم دیہات والا مکان فروخت نہیں کریں گے۔

دس بارہ دن تک مسز نادرہ کے پرائیویٹ آفس میں کام کرتا رہا۔ اس آفس میں ان کے ''سوشل سروسز'' سے متعلق معاملات کو نمٹایا جاتا تھا اور یہاں میں نے اپنے سوا اپنی قماش کے کسی کو نہیں پایا تھا۔ اس عرصے میں وہ میری مکمل کمزوری بن چکی تھی۔

میرے پاپی وجود نے مجھے مار ڈالا تھا۔ اس اثناء میں میں ڈوب ڈوب کر ابھرا اور ابھر ابھر کر ڈوبا۔ ایک پرشور لہر آتی مجھے اٹھا کر سوچ کے سمندر سے ساحل کی تپتی ریت پر پھینک جاتی۔ دوسری لہر آتی اور میں پھر غوطے کھانے لگتا۔

میں نے اپنے آپ کو خود ہی مشق ستم بنا ڈالا۔ مجھے اپنے اوپر ستم ڈھا کر خود ہی ایک تسکین سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ وہ کھینچا تانی جو میرے وجود اور ضمیر کے درمیان جاری تھی۔ اس نے اب ایک شدید جنگ کے بعد دم توڑ دیا تھا۔

میرا ضمیر میرے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ میری ماں کی زندگی بھر کی ریاضتوں کو میری چند لمحوں کی سیاہ کاریوں نے اس طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا جیسے تیز ہوا کا جھونکا راکھ کو اڑا کر لے جاتا ہے۔

.....☆☆☆.....

شراب، شباب اور دولت۔

یہ وہ نکون جس نے پھندا لگا کر میرے ضمیر کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

بیگم نادرہ کے ہاتھوں سے جب میں نے پہلی مرتبہ شراب کا جام لینے سے انکار کیا تو اس نے اپنی تمام حشر سامانیاں سمیٹ کر بڑی عجیب سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''اب بھی تم شراب نہیں پیو گے۔ گدھے۔ جو نہ کرنے والا کام تھا وہ تو تم نے کر لیا ہے۔''

اور میں نے ایک ہی جھٹکے سے وہ سارا زہر اپنے اندر انڈیل لیا۔ جو بیگم نادرہ قطرہ قطرہ کر کے مجھے پلانا چاہتی تھی۔ جس تیزی سے میں نے تنزلی کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس کا اندازہ دیدنی تھا۔ برائی قوت بن کر جب اپنا آپ منوانے پر تل جائے تو بڑے بڑے جغادری انسان بھی بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بسا اوقات معمولی رفتار کی آندھی بھی جڑوں سمیت

پورے درخت کو زمین بوس کر ڈالتی ہے۔

میری بنیاد میں ہی شاید بغاوت کے جراثیم موجود تھے۔ میری شخصیت کی بنیاد تھی ہی کیا۔ والد نے کبھی دست شفقت سر پر نہ رکھا۔ ماں مظلومیت کی تصویر بن کر مجھے بڑے بڑے آدرش دیتی رہی۔

لیکن میرے لاشعور میں کہیں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ جن عظیم اصولوں نے جنت بی بی کی زندگی کو جہنم بننے سے نہیں روکا وہ میرے کیا کام آئیں گے۔

تب شاید میرے نزدیک طاقت کا سمبل میرا باپ تھا۔ جو بڑا آدمی تھا اب میرے نزدیک طاقت کا سمبل مسز نادرہ تھی جو بری عورت تھی۔

میرے اندر بچپن سے آج تک جو مسلسل ٹوٹ پھوٹ ہوتی آ رہی تھی اس نے میری شخصیت کو بننے ہی نہ دیا۔ میری حالت اس کمزور مریض کی تھی جس پر ہر بیماری کے وائرس فوراً اثر انداز ہو جائیں۔ ممکن ہے اگر مجھے بیگم نادرہ کی بجائے کسی ''مرد کامل'' سے واسطہ پڑ جاتا تو میں اب تک کشف کی کئی منزلیں طے کر چکا ہوتا۔

.....☆☆☆.....

یہ بات نہیں کہ میرا ضمیر سو ہی گیا تھا۔

اس واقعے نے مجھے خاصا جھنجھوڑا.....

میں نے کئی مرتبہ سوچا آخر کب تک یہ سب کچھ چلتا رہے گا؟ کب تک میں حالات کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہوں گا اور سب سے بڑی بات کہ کب تک آخر بیگم نادرہ مجھے قانونی شکنجے کی گرفت میں آنے سے بچاتی رہے گی؟

کئی مرتبہ جی چاہا کہ بھاگ جاؤں؟

لیکن کہاں؟

اس سوال کے بعد میری سوچیں منجمد ہونے لگتی تھیں۔

مجھ پر شہر پناہ کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہو چکے تھے۔ کوئی راہ فرار باقی نہیں بچی تھی۔ ستم ظریفی حالات نے مجھے جرائم کی جس دلدل کی طرف دھکیلا تھا واقعی اس میں آنے کا راستہ تو تھا جانے کی کوئی راہ نہیں تھی۔

یہاں لوگ اپنی مرضی سے آسکتے تھے۔

اپنی مرضی سے واپس نہیں جاسکتے تھے۔

نادرہ بیگم نے ابھی تک مجھے تصویر کا وہ رخ نہیں دکھایا تھا جو میں آج دیکھنے جا رہا تھا۔

اس روز میں والد سے جیل میں ملاقات کے بعد واپس لوٹا تھا جب محلے میں ہمارے ہمسائے قاضی صاحب نے میرے لیے ٹیلی فون پر آیا پیغام مجھ تک پہنچایا۔

ان دنوں ٹیلی فون اتنے عام نہیں ہوا کرتے تھے درجنوں گھروں میں سے دو تین کے پاس ہی فون ہوتے تھے اور وہ عموماً علاقے کے متمول اور شریف لوگ کہلاتے تھے۔

قاضی صاحب کی بیٹیاں میری ماں سے قرآن پاک پڑھنے آیا کرتی تھیں اور انہیں ہمارے حالات کا بھی خاصا علم تھا۔ قاضی صاحب خدا ترس اور ہمدرد انسان تھے۔ میں نے ان کا فون نمبر اپنے پی پی نمبر کی حیثیت سے دیا ہوا تھا۔

جب نادرہ بیگم نے مجھے کسی خاص کام سے بلانا ہوتا تو یہاں کوئی ''میاں صاحب'' فون کر کے مجھے بلا لیا کرتے تھے اور انہیں کی زبانی مجھے نادرہ بیگم کا پیغام مل جایا کرتا تھا۔

میں نے آج تک اس ''میاں صاحب'' کو نہیں دیکھا تھا۔

قاضی صاحب نے جب بتایا کہ ''میاں صاحب'' نے جلدی دکان پر پہنچنے کے لیے کہا ہے تو مجھے فوراً سمجھ آگئی کہ کوئی خاص مہم آن پڑی ہے۔

علاقہ غیر سے آئے مجھے آج دس بارہ روز ہونے کو تھے اور اس درمیان بیگم نادرہ کی طرف سے مجھے توقعات سے کئی گنا زیادہ رقم انعام کی صورت میں مل چکی تھی۔ ان دنوں ہزار روپیہ بڑی رقم شمار ہوتی تھی اور مجھے اس مرتبہ پچیس ہزار روپے انعام ملا تھا..... شاید وہ لوگ میری بہادری سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے تھے۔

.....☆☆☆.....

تھوڑی دیر بعد میں بیگم نادرہ کے دولت خانے پر موجود تھا۔

معمول کے مطابق اس نے ضرورت سے زیادہ فراخدلی سے میرا استقبال اپنے کمرہ خاص میں کیا تھا اور میری خیریت دریافت کرنے کے بعد جلد ہی وہ مطلب کی بات پر آگئی۔

''تمہاری بہادری نے میاں صاحب کو کچھ زیادہ ہی متاثر کر دیا ہے۔''

اس نے میری طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کون میاں صاحب؟''

میں نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

''آج تم انہیں مل بھی لو گے اور جان بھی لو گے..... یہ سمجھو کہ وہ ہمارے ''باس'' ہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہے ان کے دم قدم سے ہے..... اور تم بہت خوش قسمت ہو کہ آج ان سے ملاقات کرنے جا رہے ہو ورنہ تو لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے زندگی بتا دیتے ہیں..... ارشد! ممکن ہے کچھ دنوں کے لیے تمہیں ان کے ساتھ رہنا پڑے..... اسے اپنا اعزاز سمجھنا اور اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا کہ میں تمہارے ساتھ موجود نہیں ہوں.....''

اس کے آخری فقرے نے مجھ کو چونکا دیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میرا مطلب تم جانتے ہو ارشد! اب میں شدت سے تمہاری کمی محسوس کرنے لگی ہوں۔ میاں صاحب کو تم جیسے بہادر اور ہوشیار نوجوان پسند آ جائیں تو وہ انہیں دنوں میں کروڑ پتی بنا دیا کرتے ہیں..... یہ ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ ملتے رہنے کی اجازت دے دی ہے..... ورنہ جو لوگ ان کے حلقہ خاص میں شامل ہو جائیں انہیں میاں صاحب دوسروں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیا کرتے..... یوں سمجھ لو کہ آج سے تم اس کلب کے ''وی آئی پی'' ممبر بن گئے ہو۔''

میڈم اپنے اس گروہ کو ''کلب'' کہا کرتی تھیں۔

''جو حکم میڈم.....''

میں نے اطاعت میں سر جھکا دیا۔

تھوڑی دیر بعد میاں صاحب کی آمد کی اطلاع بھی مل گئی اور اب میں میڈم کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں میاں صاحب سے ملاقات کرنے جا رہا تھا۔

.....☆☆☆.....

میاں صاحب بڑے کروفر سے ایک صوفے پر براجمان تھے.....

ان کی شکل پر ایک نظر پڑتے ہی مجھے یوں لگا جیسے زمین نے اچانک میرے پاؤں پکڑ

لیے ہوں۔ میں حیرانگی سے بت بن کر رہ گیا۔

میاں صاحب کی شکل میں میرے سامنے ہمارے ملک کا مشہور ایم این اے بیٹھا تھا جس کی تصاویر اور بیانات کے بغیر کوئی بھی اخبار نامکمل سمجھا جاتا تھا۔

میاں صاحب کا تعلق تو ایک سرحدی دیہات سے تھا۔

لیکن.....

ان کا قیام زیادہ تر شہر ہی میں ہوتا تھا۔ صرف الیکشن کے دنوں میں ان کا جانا اپنے آبائی گھر ہوتا تھا تاکہ وہاں اپنے نسل در نسل غلاموں سے ووٹ کی صورت میں اپنا خراج وصول کر سکیں۔

''تمہاری بہادری کی بہت تعریف سنی ہے نوجوان.....''

انہوں نے بیٹھے بیٹھے میرے سلام کا جواب دیئے بغیر سامنے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔

میڈم نادرہ بھی میرے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

''آج سے تم ''کلب'' کے حلقہ خاص میں شامل ہو رہے ہو..... اب تم ''خاص'' بن گئے ہو اس لیے تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ ''عام'' لوگوں والی کوئی حرکت نہ کرنا..... میں تمہیں کچھ دنوں کے لیے سرحدی علاقے میں بھیج رہا ہوں..... احمد خان تمہیں باقی سب کچھ سمجھا دے گا۔ تم سے ملاقات ہوتی رہے گی..... گھر بھی آتے رہو گے لیکن فی الوقت یہاں کے تمام لوگوں کو بھول جاؤ.....''

یوں لگتا تھا اس شخص نے ساری زندگی احکامات ہی جاری کیے ہیں۔

میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہا.....

ابھی تک میں اس کی شخصیت کے اسرار میں ہی پھنسا تھا۔

''یہ بات تو تم جانتے ہی ہو کہ تم نے زندگی میں کبھی میاں صاحب سے ملاقات نہیں کی۔''

میڈم نادرہ نے میری طرف یہ کہتے ہوئے مسکراہٹ اچھالی تو میرے تنے ہوئے اعصاب قدرے پرسکون ہو گئے.....

میاں صاحب نے کمال شفقت سے ہمارے ساتھ ڈنر کیا اور تشریف لے گئے۔ روانگی پر انہوں نے میری ملاقات احمد خان سے کروادی تھی۔

ڈھلتی عمر کا احمد خان شکل ہی سے درندہ دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے اگلے روز مجھے ایک سیر گاہ میں بلایا جہاں سے ہمیں پھر سرحدی علاقے کی طرف جانا تھا۔

میاں صاحب، چلے گئے.....

میں پتھر کا بت بنا ٹکر ٹکر کبھی میڈم نادرہ اور کبھی انہیں دیکھتا رہا..... میری قوت فیصلہ مفقود ہو چکی تھی۔

اگر ہوتی بھی تو میں کیا کر لیتا۔

یہاں میری مرضی سے کچھ ہونے والا نہیں تھا۔

اب میں بے اختیار تھا۔

میں نے اپنے گھر والوں کو بچانے کے لیے خود کو گروی رکھ دیا تھا میری جان پر اب میرا نہیں ان لوگوں کا اختیار تھا جو میرے ان داتا بنے ہوئے تھے۔

میں نے سر تسلیم خم کیا۔

ماں کو بیرونی شہروں کے دورے کا بہانہ بنایا اور رخت سفر باندھ لیا.....

.....☆☆☆.....

احمد خان مطلوبہ جگہ میرا منتظر تھا۔

اس نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا.....

ایک شاندار آرام دہ جیپ میں سفر کرتے ہوئے ہم بالآخر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہ راجستھان کی سرحد کے نزدیک کا ایک قصبہ تھا جہاں بلا شرکت غیرے ان لوگوں کی بادشاہت قائم تھی۔ جس کا اندازہ مجھے یہاں آمد کے فوراً بعد ہی ہو گیا تھا۔ مقامی انتظامیہ تو ان کا پانی بھرتی تھی۔

کیا مجال جو کسی نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی کی ہو۔ وہ رات میری تھی.....

ان لوگوں نے میرے اعزاز میں دعوت شیراز برپا کی تھی۔

یہاں وہ سب کچھ تھا جو اب میرے لئے معمول کی بات بن چکی تھی۔

لیکن.....

حیرت انگیز طور پر انہوں نے جنگل کو منگل بنا دیا تھا۔ اس قصبے میں کہ جہاں زندگی کی عام سہولتیں بھی جو کسی ذی شعور کو حاصل ہونی چاہئیں نہ ہونے کے برابر تھیں ان لوگوں نے ایک بڑے شہر کا سارا ہنگامہ اکٹھا کر لیا تھا۔

اس محفل شباب میں مقامی انتظامیہ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ بیشتر مقامی افسران ناچ گانا دیکھ رہے تھے۔

اور.....

رات دیر گئے محفل اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی تو ان پر مکمل مدہوشی طاری تھی۔

.....☆☆☆.....

اگلے روز مجھے سرحدی ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات غلام حسین سے ہوئی۔

غلام حسین کو اس سرحد کا کیڑا سمجھا جاتا تھا.....

وہ بھارتی سرحدی پوسٹوں کے عین سامنے سے سانپ کی طرح رینگ کر گزر جاتا اور کوئی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اگلے روز میں اس کے ساتھ سرحد عبور کر کے بھارتی علاقے میں پہنچ گیا تیسرے روز ہماری واپسی ہو گئی.....

پھر یہ سلسلہ چل نکلا.....

دو ماہ میں اس سرحد سے میں نے دس مرتبہ بارڈر عبور کیا اور کامیاب پھیرے لگائے۔

میرا کام ادھر کا مال ادھر لے جانا اور ادھر کا مال اس طرف لانا تھا۔

پہلے پہل تو میں سرحدی علاقے کے نزدیکی دیہاتوں تک گیا۔ جس کے بعد نزدیکی شہروں تک جانے لگا۔

اور.....

ایک روز دوسری پارٹی کے لوگ مجھے موج میلہ کروانے دہلی لے گئے یہاں کی دنیا میرے لئے طلسم ہوشربا سے کم نہیں تھی۔

ان دنوں سیٹ لائٹ یا ڈش وغیرہ کا دور دور تک تصور نہیں تھا۔ بھارتی ٹی وی کی نشریات بھی ہمارے ملک تک نہیں پہنچتی تھیں۔اس لیے کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ سرحد کے دوسری طرف کس طرح کی قوم آباد ہے۔

ان لوگوں کی بے حیائی نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ تو ہم سے بہت آگے نکل گئے تھے اور میرے جیسے نوجوان کا جو پہلے ہی گناہوں کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا ان سے متاثر ہونا کوئی عجیب بات بھی نہیں تھی.....

دہلی سے واپسی پر دہلی کا نشہ مجھے کئی روز تک چڑھا رہا۔

اس دوران میرا گھر سے رابطہ مسلسل رہا۔ جب بھی دوسری طرف سے واپس آتا دو تین روز کے لیے اپنے شہر چلا جاتا جہاں میڈم نادرہ سے ملاقات بھی ضرور ہوتی۔

لیکن.....حیرت انگیز طور پر اس نے کبھی مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور میں نے خود کچھ نہیں بتایا کیونکہ اس ''کلب'' کا یہ اصول تھا کہ کسی بھی قسم کی معلومات کو صرف خود تک محدود رکھا جاتا تھا.....

یہاں نہ کسی کا بھید لیا جاتا تھا نہ کسی کو بھید دیا جاتا تھا۔اس دوران میں واقعی دولت مند ہو گیا۔

اب میری حیثیت ایک کامیاب سمگلر والی ہو گئی تھی جو اپنا کام کامیابی سے چلا سکتا تھا۔

یہاں میرا جعلی نام اور جعلی شناخت تھی اور ہمارے گروہ کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کبھی ہمیں یہ گمان نہیں گزرنے دیا تھا کہ ہم دوسری طرف گرفتار بھی ہو سکتے ہیں اس روز میں ایک اہم مشن پر جا رہا تھا۔

غلام حسین میرے ساتھ اور ہم نے سرحد اپنے علاقے سے کچھ ہٹ کر عبور کرنی تھی کیونکہ یہاں اب رینجرز نے بہت سختی شروع کر دی تھی۔

.....☆☆☆.....

راجستھان کا طویل و عریض صحرا دیکھ کر دن کی روشنی میں کم از کم میں نے کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ یہاں ایسی صورتحال کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ چاروں سمت پھیلا ہوا ریت کا سمندر۔

میلوں تک بے آب و گیاہ ٹیلوں کا سلسلہ.....

پانی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ سرحدی چوکیاں ایک دوسرے سے پانچ پانچ میل کے فاصلے پر تھیں۔ کبھی کبھی رات کو گشتی دستے اونٹوں پر سوار سرحد پر گشت کیا کرتے تھے اور وہ آپس میں ملاپ کرنے کے لیے کافی دور سے ایک دوسرے کو بڑی بڑی اور طاقت ور ٹارچوں کے ذریعے سگنل دیا کرتے تھے۔

آج کا دن صبح ہی سے کچھ عجیب سی نحوست لے کر چڑھا تھا۔ پہلے تو اپنے علاقے ہی میں پولیس سے مقابلہ کرنا پڑا تھا بمشکل ہم جان و مال بچا کر نکل سکے تھے اور اب اس مصیبت نے آن گھیرا تھا۔ دیوالی کی رات تھی اور ہم لوگ خاص ساز و سامان کے ساتھ سرحد کی سمت جا رہے تھے۔

جہاں ایک مخصوص مقام پر دونوں کا ملاپ ہونا تھا اور اس کے بعد اشیاء کا تبادلہ۔

میرے باس نے شام کو روانگی کے وقت سب سے الگ تھلگ لے جا کر مجھے ایک کپڑے کی جیکٹ نیچے پہننے کے لیے دی تھی جس میں سونے کے بسکٹ جنہیں ہم اپنی زبان میں ''رینی'' کہتے ہیں، بڑے سلیقے سے سلی ہوئی تھیں۔ قریباً دو کلو سونا اور بیس ہزار روپے کی کرنسی!

''یہ امانت ہر حال میں بدی چند کو پہنچانی ہے.....''

میرے باس نے بڑی تیز سرگوشی میں کہا۔

''ٹھیک ہے سیٹھ.....!''

ابھی ہم لوگوں نے سرحد پار کر کے دوسرے علاقے میں بمشکل ایک فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک یوں لگا جیسے آسمان سے آگ برسنے لگی ہو۔ پہلے پہل تو ہم سمجھے جیسے یونہی کوئی آتش بازی کر رہا ہے۔ اتفاق سے آج رات بھی دیوالی کی تھی اور کوئی بعید نہیں تھا کہ خالصہ نشے کی ترنگ میں رات کو ''ویری لائٹ'' (روشنی راؤنڈ) فائر کر بیٹھے۔

جو لوگ سمگلنگ کے پیشے سے ذرا سی بھی آشنائی رکھتے ہیں، انہیں بخوبی علم ہے کہ ایسی راتیں، خاص طور پر ہولی، دیوالی یا گورپورب کی راتیں سمگلروں کے لیے بہترین راتیں ہوا کرتی ہیں، تمام بڑی بڑی پارٹیاں ایسے مواقع کا بہت عرصہ پہلے سے انتظار شروع کر دیتی ہیں۔ ہم لوگ حسب سابق لاپروائی سے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

میرے آگے آگے دو آدمیوں نے سٹین گنیں پکڑ رکھی تھیں، جب کہ ہم دونوں کے درمیان ایک آدمی دو اونٹوں کی نکیل تھامے ہوئے تھا۔ ایک اونٹ کی رسی میں نے تھام رکھی تھی۔

پہلا راؤنڈ فائر ہوتے ہی ہم ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر رہ گئے۔ میرے آگے آگے غلام حسین تھا ہمارے علاقے کا مانا ہوا اسمگلر جو محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سرحد پار کر جاتا تھا لیکن اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔ میں پھرتی سے اس کے قریب آ گیا۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے باہر آ چکا تھا، اور اس کی روشنی میں غلام حسین کی آنکھیں چاروں طرف تیزی سے گردش کرتی نظر آ رہی تھیں۔ داہنی طرف سے ایک گن نے فائرنگ شروع کی۔

''چارہ کر جاؤ جوانو۔''

مجھے غلام حسین کی تیز سرگوشی سنائی دی۔ وہ اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ناگ پورے غیظ و غضب کے ساتھ پھنکار رہا ہو۔

ابھی ہم جان بچانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ''ہالٹ'' کا نعرہ گونجا۔ اس کے ساتھ ہی

گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ سنسناتی ہوئی گولی سب سے اگلے ساتھی کے پیٹ میں لگی وہ نیچے گرا اور اونٹ بدک کر بھاگ اٹھے اسی ایک لمحے سے ہم نے فائدہ اٹھا لیا۔

میں نے غلام حسین کے پیچھے ہی سرکنڈے میں چھلانگ لگا دی ہم دونوں افراتفری میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے۔

صحرائی سرکنڈوں نے میری ٹانگیں چھیل ڈالی تھیں لیکن ہم دونوں اس تکلیف سے بالکل بے نیاز اندھا دھند بھاگے جا رہے تھے۔ ہمیں اپنی سمت کا بھی ٹھیک سے کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ تاہم ہمارا خیال یہی تھا کہ ہم نہر کی سمت بھاگ رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے اچانک غلام حسین لڑکھڑا کر گر پڑا میں نے بھی اپنے قدم وہیں روک لیے۔

اف میرے خدایا! اس کی ران میں گولی پیوست ہو چکی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی تو ایک گولی سائیں کرتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔

''پتری! چارہ کر جا میری کوئی واہ نہیں او۔'' (بیٹا! بھاگ جاؤ میرا کوئی زور نہیں چل رہا)۔

غلام حسین نے کراہتے ہوئے کہا اس کے ساتھ ہی وہ سٹین گن کی ناگ کھینچ رہا تھا۔

''چاچا.....!'' میرے منہ سے صرف اتنا ہی لفظ نکل سکا اور غلام حسین نے اچانک اسٹین گن اٹھا کر پورا برسٹ فائر کر دیا۔

''نکل جا.....!'' اس نے مجھے گھور کر دیکھا اس کی آنکھوں میں عجیب وحشت ناچ رہی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے کمر کے گرد بندھے تھیلے سے میگزین نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''رب راکھا.....!'' اس نے میری طرف دیکھا.....!

''رب راکھا.....!'' میری زبان نے لڑکھڑاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

.....☆☆☆.....

میں گھٹنوں کے بل جھک کر تیزی سے ایک طرف بھاگنے لگا۔ واپس اپنے علاقے کی طرف آنا اب بالکل ناممکن تھا۔ اس لیے میں اندازاً نہر کی سمت ہی چل پڑا تھا۔ روشنی کا ایک طوفان میرے پیچھے تھا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی گولیاں میرے دائیں بائیں تیزی سے گزر رہی تھی۔

اب تھری ناٹ تھری کی آواز میں غلام حسین کی سٹین گن کی آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔ میرے جسم کے مختلف حصوں پر چبھنے والے کانٹوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن موت کا خوف اس تکلیف پر غالب تھا۔ میں اندازاً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔

اچانک میرے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور میں لڑکھڑا کر گر گیا میرے گرتے ہی شڑاپ کی آواز آئی اور جسم کو نمی کا احساس ہوا۔ میں نہر کے کنارے سے پھسل کر نہر میں گر چکا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ نہر کے کنارے کوئی ناکہ نہیں تھا ورنہ رات کو پانی میں پیدا ہونے والی آواز کسی قیامت سے کم نہیں ہوتی۔

میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور خود کو مردہ تیراکی کی حالت میں پانی پر ڈال دیا دراصل میں یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ یہاں قریب کوئی موجود تو نہیں ہے۔ جب کوئی بھی ردعمل نہ ہوا تو میں آہستہ آہستہ دوسرے کنارے آن لگا۔ میرے پیچھے گولیوں کی آواز تقریباً بند ہو چکی تھی۔ کبھی کبھار اکا دکا فائر کی آواز آ جاتی تھی۔ غالباً وہ اپنا اطمینان کرنے کے لیے اسلحہ پھونک رہے تھے۔

میں نہر کے کنارے ایک کماد کے کھیت میں لیٹا یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ واپس لوٹنا صریحاً موت کو دعوت دینے والی بات تھی، کیونکہ یہ صاف ظاہر تھا کہ فائرنگ کی آواز نے دوسرے علاقے کی رینجرز کو بھی خبردار کر دیا ہوگا اور وہ لوگ بھی چوکنے ہو گئے ہوں گے۔

رہی کھیت سے باہر نکلنے والی بات تو وہ یوں ناممکن تھی کہ میرے تمام کپڑے بھیگ چکے تھے اور گیلے کپڑوں کے ساتھ اس حالت میں سفر کرنا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا، ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ تھوڑا سا آرام ملا تو جسم کے مختلف حصوں نے درد کرنا شروع کر دیا۔

اگر کوئی چیز میرے لیے اطمینان بخش تھی تو صرف یہ کہ میری اندرونی جیکٹ کی جیب کرنسی سے بھری ہوئی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا تھا کہ میں یہیں رک کر رات گزاروں اور پھر اگلے روز کپڑے سوکھنے تک یہیں چھپا رہوں۔

کھیت نہر کے کنارے سے ہٹ کر تقریباً دو فرلانگ دور واقع تھا اور اطمینان بخش بات

یہ تھی کہ کماد کی فصل اب کٹنے والی تھی۔ اس لیے کسی کے یہاں آنے کا امکان بھی بہت کم تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور آئندہ کبھی بھی سمگلنگ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

ساون کی رات کسی وقت کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی تھی۔ مجھے صرف ایک بات کا خوف تھا کہیں بارش شروع نہ ہو جائے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر چیز پر سکون ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مرتبہ سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد میں بالکل مطمئن ہو گیا تھا کبھی کبھی غلام حسین کا خیال آ جاتا تو دل جیسے بیٹھنے لگتا۔ مجھے علم تھا کہ اتنا مال حاصل کرنے کے لیے دشمن کسی بھی کمینگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اکثر سننے میں آیا تھا کہ بھارتی علاقے والے تو صرف بیس کلو افیون کے لیے اسمگلر کو گولی مار دیا کرتے تھے۔

.....☆☆☆.....

وہ رات حقیقت میں کسی قیامت سے کم نہ تھی، ایک لمحے کے لیے بھی میری آنکھ نہ لگ سکی، کبھی کسی زخم کی ٹیس بے قرار کر دیتی، کبھی کھیتوں کے باہر ذرا سی سرسراہٹ سے چونک پڑتا۔ کوئی بھولا بھٹکا گیدڑ یا پھر سؤر ادھر آ نکلتا تو مجھے چوکنا ہو کر بیٹھنا پڑتا طلوع سحر کے قریب میں نے کھیت سے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا۔

میرے کپڑے کسی حد تک خشک ہو چکے تھے۔ میرے سامنے کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا اور اس کے بعد ریلوے لائن تھی جسے عبور کر کے میں اس پکی سڑک پر آ سکتا تھا جو سیدھی گنگا نگر کو جاتی تھی۔ ابھی مندروں اور گردواروں میں پوجا پاٹھ شروع نہیں ہوئی تھی۔ تاہم کہیں کہیں بہت دور سے ٹریکٹروں کے چلنے کی آواز اور ان کی روشنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ریلوے لائن تک پہنچ چکا تھا۔

''سپیشل ناکہ'' کافی دور تک اور بہت پھیلا کر لگایا جاتا ہے۔ بارڈر سکیورٹی پولیس کا طریق کار تو بڑا عجیب قسم کا تھا۔ یہ باقاعدہ ایک علیحدہ اور جدید فوجی خطوط پر منظم تنظیم ہے جس کے ذمے سرحدوں کی حفاظت اور دوران جنگ باقاعدہ فوج کے ساتھ مل کر لڑنا شامل تھا۔

جب کبھی بی ایس ایف کا ناکہ لگتا تو وہ اپنے کمپنی ہیڈ کوارٹر کو قریباً خالی کر دیتے تھے وہاں موجود ہزاروں ریزرو جوان بارڈر پر کافی پیچھے تک پھیلا کر ڈیپلائے کر دیئے جاتے تھے تاکہ کسی بھی صورت میں دشمن کے بچنے کا کوئی بھی چانس باقی نہ رہے۔۔

یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ وہ لوگ ریلوے لائن کے ساتھ مورچہ بند ہوں گے۔ کھیت ریلوے لائن کے نیچے تھے اور ریلوے لائن کے اردگرد ڈھلوان کی صورت میں پتھروں اور مٹی کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ ریلوے لائن کھیتوں سے اونچی ہونے کی وجہ سے دوسری طرف سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے پہلا قدم آگے بڑھایا اور دوسرے ہی لمحے ٹھٹھک کر رہ گیا، کیونکہ دوسری طرف سے کسی کے آہستہ آہستہ بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

خوف کی ایک سرد لہر میرے رگ وپے میں سرایت کر گئی۔ میں بڑی تیزی سے پیٹھ کے بل جھک کر لائن کے ساتھ ساتھ آواز کی مخالف سمت چل پڑا اسی حالت میں میں قریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر گیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تو میں ریلوے لائن عبور کر کے دوسری طرف کھیتوں میں داخل ہو گیا۔

اس وقت مجھے دوسری پارٹی کے سربراہ ''بدی چند'' کو جو دہلی کا مانا ہوا اسمگلر تھا یہ کرنسی نوٹ پہنچانے تھے مجھے اس بات کا یقین تھا کہ ایک مرتبہ اس تک پہنچنے کے بعد کسی کی جرأت نہیں تھی کہ مجھے میلی آنکھ سے دیکھ سکے۔ بدی چند کا گروہ اور میرے باس کا گروہ بین الاقوامی اسمگلنگ کرتے تھے۔ طریقہ واردات دونوں کا ایک ہی تھا یعنی سرحدوں پر مردوں سے کام لیا جاتا اور سرحدوں کے اندر خوبصورت عورتوں سے۔

.....☆☆☆.....

اب مجھے ہر صورت میں دہلی پہنچنا تھا اور یہاں سے جلد از جلد نکلنا بھی تھا ورنہ صبح کا اجالا پھیلتے ہی سرحدی چوکی کا کھوجی میرا سراغ لگا کر بی ایس ایف کو میرے سر پر لا کھڑا کرتا۔ بی ایس ایف کے پاس اس مقصد کے لیے سدھائے ہوئے کتے کافی تعداد میں موجود تھے اور کتوں سے اپنی نگرانی کروانے سے میں اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ کر مر جانے کو ترجیح دیتا۔ میں نے احتیاطاً

سڑک کو چھوڑ دیا تھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سفر کر رہا تھا۔ اب زندگی بیدار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مندروں اور گوردواروں سے پوجا پاٹ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کسان اپنے کھیتوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ گاؤں کی زندگی مکمل بیدار ہو چکی تھی اور یہی وقت تھا میرے اور زیادہ محتاط ہو جانے کا۔ کیونکہ قریبی ایک دو گاؤں کے علاوہ مجھے کسی بھی گاؤں کا نام یاد نہیں تھا۔ جب بھی کوئی دیہاتی میرے قریب سے گزرتا تو میں محض دکھاوے کے لیے منہ سے ''رام، رام'' کہنا شروع کر دیتا اور یوں وہ بغیر توجہ دیئے میرے قریب سے گزر جاتا۔ میری معلومات اس سے زیادہ نہیں تھیں۔

شہر تک پہنچنے کے لیے مجھے قریباً پانچ چھ میل لمبا چکر لگا کر قریبی بس اڈے تک پہنچنا تھا جہاں سے ٹمپو اور لوکل بسیں گنگا نگر جاتی تھیں۔ پھر ایک ٹمپو میں بیٹھ کر میں گنگا نگر پہنچ گیا۔ ایک ''دشنو ڈھابے'' پر میں نے ناشتہ کیا، بازار سے نئی دھوتی قمیض اور جوتی خریدی، بازار سے باہر ایک سنسان سی جگہ پر ایک مندر میں شنان کر کے کپڑے بدلے قمیض کے نیچے پہنی ہوئی کپڑے کی جیکٹ میں نوٹ بڑے سلیقے سے سلے ہوئے تھے۔

میں نے قریباً ہزار روپے کے نوٹ نکال لیے تھے جو اب میرے زیر استعمال تھے دو دکانوں سے میں نے بڑے نوٹ تڑوائے تھے تاکہ نئے نوٹ کسی کو خواہ مخواہ شک میں مبتلا نہ کر دیں۔ یہاں سے ٹرین سیدھی بٹھنڈا سے ہو کر دہلی جاتی تھی۔ لیکن میں نے بطور احتیاط اسے چھوڑ دیا اور بس کے ذریعے گنگا نگر سے ابوہر پہنچا۔ وہاں سے بس بدل کر موگے اور موگے سے بذریعہ بٹ لدھیانہ پہنچ گیا۔ یہ تمام راستے اور یہاں کے ماحول سے واقفیت مجھے غلام حسین کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔

لدھیانہ پہنچتے تک رات کے نو بج چکے تھے۔ راستے میں میں نے کسی بھی ایسی بس سے سفر نہیں کیا تھا جو کسی سرحدی علاقے سے چلتی ہو اس لیے ابھی تک کسی بس کو چیکنگ کے مرحلے سے بھی نہیں گزرنا پڑا تھا۔ میرے پاس اتنی دولت تھی کہ چاہتا تو لدھیانہ کے کسی بھی اے کلاس ہوٹل میں ٹھاٹھ سے رات گزار لیتا۔ ''لیکن احتیاط کا دامن میں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ اور یہی اب

تک میرے بچے رہنے کا راز تھا۔

میں نے رات کسی آشرم میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ میرا حلیہ بالکل دیہاتیوں جیسا تھا۔ لیکن زبان پر عبور نہ حاصل ہونے کی وجہ سے میں بہت کم بولتا تھا.....

.....☆☆☆.....

ریلوے اسٹیشن سے اتر کر میں جی ٹی روڈ پر پیدل تین نمبر ڈویژن تھانے کے سامنے سے گزرتا ہوا ماتا رانی چوک میں آ گیا، میرے دائیں طرف لدھیانے کا مشہور چوڑا بازار اور بائیں ہاتھ گھنٹہ گھر تھا۔ جس کے عقب میں پیپل کا ایک بوڑھا درخت یہاں کسی آشرم یا سرائے کی موجودگی کی چغلی کھا رہا تھا۔ دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتا ہوا میں آشرم کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا میرے دائیں ہاتھ ایک کشمیری پنڈت کمرے میں بیٹھا نظر آ رہا تھا۔

یہ غالباً آشرم کا پروہت تھا۔

''نمستے پنجاری جی.....''

میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''نمستے.....!'' اس نے جواب میں اپنی نشے کے زیر اثر سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔

''مہاراج جی.....کمرہ مل جائے گا.....!''

''کیا.....؟''

اس نے میری حالت دیکھ کر مجھے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے مہاراج.....رات بسر کرنے کو کوئی کھاٹ مل جائے۔''

''بھاگ جا بے.....''

اس نے مجھے گھور کر دوبارہ دیکھا۔

''مہاراج جی.....! سیوک ہیں آپ کے.....''

میں نے اپنا ہاتھ کرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے دس دس کے دو نوٹ اس کی مٹھی میں ڈال دیئے۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

اس نے ایک بوسیدہ سا رجسٹر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''کندن لال.....!''

''پتا کا نام؟''

''چونی لال.....!''

''ایڈریس؟''

''آلی محلہ جالندھر۔''

''کیوں آئے ہو؟''

''مہاراج جی.....دکان کا سودا خریدنے۔''

''یہ لو چابی سامنے کی سیڑھیاں چڑھ کر 9 نمبر کمرہ ہے۔''

''دھنواد.....دھنواد!!''

اتنی ہندی میں بول لیتا تھا۔

وہ رات جوں توں کر کے میں نے 9 نمبر کمرے میں کاٹی۔ صبح اٹھ کر نہا دھو کر آشرم سے پرشاد کھایا اور باہر نکل آیا۔ ایک مرتبہ غلام حسین اور امر جیت سنگھ کے ساتھ لدھیانے آنے کا اتفاق ہوا تھا کچھ کچھ نقشہ سڑکوں کا میرے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ اسی یادداشت کے سہارے میں سڑک کے کنارے چلتا ہوا پیدل ہی اسٹیشن تک جا پہنچا۔ جہاں 10 بجے کشمیر میل کے ذریعے مجھے دہلی پہنچنا تھا۔

ابھی صبح کے آٹھ بجے تھے۔ دو گھنٹے مسلسل بیٹھے رہنا بھی ذرا معیوب دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے میں نے ٹکٹ خریدنے کے بعد اسٹیشن سے باہر وقت گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسٹیشن سے پیدل چلتا ہوا میں واپس ماتا رانی چوک کی طرف آ گیا۔ جہاں سے میں چوڑے بازار میں داخل ہو گیا۔

بازار میں ایک ٹی سٹال پر بیٹھ کر میں نے چائے کا ایک کپ حلق سے اتارا اور خواہ مخواہ

سامنے پڑا ہوا گورمکھی زبان کا ایک اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اخبار اٹھاتے وقت نجانے کیوں میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ سامنے بیٹھا ہوا ایک سکھ مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔ جونہی میں نے اس کی طرف دیکھا اس نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

''کون ہے یہ.....!'' میرے ذہن میں اچانک دھماکہ ہوا۔

پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ آشرم سے نکلتے ہوئے اور ٹکٹ خریدتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔

.....☆☆☆.....

''سی آئی ڈی'' میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔

''وہ آشرم سے مسلسل میری نگرانی کر رہا ہے۔ ایسے گدھوں کو میں فوراً پہچان لیا کرتا تھا۔ کیونکہ میں بھارت کے سرحدی دیہاتوں میں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ بازار میں ابھی چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ بس اکا دکا دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور اسے ڈاج دینے کے لیے بازار میں رش کا سہارا لینا بہت ضروری تھا۔ پھر آہستہ آہستہ دکانیں کھلنا شروع ہوگئیں۔

میں ابھی تک بظاہر اس سے بے نیاز اخبار پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اب تقریباً نو بجنے والے تھے اور بازار میں بھی کچھ چہل پہل ہوگئی تھی۔ میں نے دکان سے باہر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر پر بل ادا کر کے باہر نکل آیا۔ کنکھیوں سے میں نے دیکھا کہ وہ بھی میرے پیچھے ہی آ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا! تو بھی کیا یاد کرے گا کس شخص سے پالا پڑا تھا۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا اور آہستہ آہستہ ایک طرف کو چل دیا۔ راستے میں میں نے ایک دکان سے سگریٹ خریدے اور وہ بھی خواہ مخواہ چیزیں دیکھنے کے بہانے رک گیا تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے دسہرا گراؤنڈ تک آ گئے تھے۔

میرے دائیں ہاتھ ایک تنگ سی گلی تھی جس کے بعد گلیوں کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا تھا۔ گلی میں ذرا آگے جا کر میں یکدم واپس مڑ گیا۔ مجھے واپس آتا دیکھ کر وہ بھی فوراً الٹے پاؤں

گھوم گیا اور اسی لمحے سے فائدہ اٹھا کر میں بڑی تیزی سے ساتھ والی گلی میں گھس گیا۔ تھوڑی دور چل کر ایک گلی بائیں ہاتھ کو جاتی تھی جس میں گھومتے ہوئے اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اور تیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔ یہ کوئی بہت پرانا محلہ تھا۔ جس میں ہمارے لاہور کے قدیمی محلوں کی طرح تین تین منزلہ اونچے مکان تھے جن میں کئی کئی خاندان رہا کرتے تھے۔

گلی میں گھستے ہی بائیں ہاتھ ایک سرکاری نل کے نیچے عورتوں اور بچوں کے برتنوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ نل کے اوپر سیڑھیاں تھیں جو اوپر جا رہی تھیں۔

میں فوراً ہی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ بلڈنگ کچھ نئی معلوم ہو رہی تھی۔ غالباً مالک مکان نے گرا کر اسے فلیٹوں کی طرز پر بنایا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتا ہوا میں مکان کی چھت پر پہنچ گیا۔ جہاں دھوپ میں ایک بوڑھا آدمی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

''پاؤں پڑتا ہوں مہاراج جی.....؟

میں نے ہانپتے ہوئے اس سے کہا۔

''جیتے رہو.....کون ہو تم؟''

''چاچا! مجھے نہیں پہچانا۔ میں ترلوک ہوں ترلوک.....!''

میں نے منڈیر کے نزدیک ہوتے ہوئے نیچے نظر ڈال کر کہا۔ نیچے وہ گدھا ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا پھر ایک بچے سے اس نے کچھ پوچھا اور تیزی سے گلی کی مخالف سمت گھوم کر سامنے والی گلی میں داخل ہوگیا۔

''کون.....ترلوک.....؟''

بوڑھے نے اپنے دماغ پر زور دے کر کہا۔

''اوہ! چاچا کیا ہوگیا ہے تجھے.....اچھا میں نیچے سے ٹرکن لے کر آیا.....''

پھر وہ مجھے پکارتا ہی رہ گیا اور میں تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا اور نیچے والوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر بڑی پھرتی سے اسی راستے واپس آ گیا جہاں سے ہم گزر کر یہاں تک پہنچے تھے۔ دسہرا گراؤنڈ کے نزدیک ہی ایک بنا کٹا ہبی سنگھ اپنا سائیکل رکشہ لیے کھڑا تھا۔ میں پھرتی سے

اس کے رکشے میں بیٹھ گیا۔

''کہاں جاؤ گے مہاراج جی.....؟''

''ماڈل ٹاؤن.....؟''

ماڈل ٹاؤن کے نزدیک بسوں کا نیا اڈہ ہے جہاں سے بسیں ہر طرف جاتی ہیں۔ دوبارہ اسٹیشن جانے کو خطرناک سمجھتے ہوئے میں نے بسوں کے ذریعے سفر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

''تین روپے ہوں گے مہاراج جی.....!''

''یار پانچ روپے لے لینا لیکن مجھے دس منٹ سے پہلے وہاں پہنچا دو ورنہ روڈ ویز کی بس نکل جائے گی اور پھر دو گھنٹے بعد دوسری بس چلے گی.....!''

''چنگا مہاراج جی.....''

اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بڑی پھرتی سے اپنی چادر کو لنگوٹی کی طرح باندھا اور مشینی انداز میں پاؤں چلانے لگا۔

راستے میں دو تین دفعہ بال بال بچتے ہوئے پندرہ منٹ میں ہم ماڈل ٹاؤن پہنچ گئے۔ میں اڈے سے باہر ہی اتر گیا۔ سامنے انبالے کی بس مکمل لوڈ ہو کر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ یہاں ٹکٹ لائن میں باہر سے ملتے ہیں۔ میں ناامید سا ہو گیا۔ لیکن کسی خیال کے ساتھ تیزی سے میں کنڈکٹر کی طرف بھاگا جو کسی کتاب پر دستخط کرنے کے بعد بس کی طرف جا رہا تھا۔

''ویر جی.....! کوئی گنجائش!''

''کتنی سواریاں ہو.....؟'' اس نے ازراہ ترحم مجھ سے پوچھا۔

''سوا لکھ.....'' میں نے خالص سکھوں والے لہجے میں کہا۔ میرا مخاطب سردار تھا۔

''آجا یار.....دیکھی جاؤ گی۔''

.....☆☆☆.....

اس نے مجھے کنڈکٹر والی سیٹ پر بٹھا دیا۔ جوں توں کر کے ہم لوگ شام قریباً پانچ بجے انبالہ پہنچ گئے۔ انبالے سے رات آٹھ بجے پسنجر ٹرین دہلی کی طرف جاتی تھی۔ میں نے آٹھ بجے کا

وقت سٹیشن کے قریب ہی واقع ایک باغ میں یا پھر مختلف ٹی سٹالوں اور ایک ویشنو ڈھابے پر روٹی کھا کر گزارا اور آٹھ بجے پسنجر پر سوار ہو گیا۔

میں نے تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدا تھا اور جس ڈبے میں سوار ہوا تھا اس میں بمشکل پندرہ یا بیس آدمی تھے۔ میں ایک برتھ پر جا کر اطمینان سے لیٹ گیا اور انبالے سے خریدا ہوا کمبل اپنے اوپر اوڑھ لیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ ٹرین ہچکولے کھاتی، جھومتی، ڈگمگاتی چلی جا رہی تھی۔ راستے میں کہیں کہیں شدید قسم کا جھٹکا لگنے سے میری آنکھ کھل جاتی۔ ورنہ میں آرام سے سوتا رہا۔ صبح قریباً چھ بجے گاڑی دہلی سٹی کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ یہاں اتر کر میں نے اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ اپنی دانست میں اب ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا تھا۔

.....☆☆☆.....

میں نے بدی چند کے گھر جانا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ وہ تقریباً ہر وقت زیر نگرانی رہا کرتا تھا۔ قریباً آٹھ بجے میں قرول باغ کے ایک جنرل سٹور پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں دکان کے تہہ خانے میں بنے ہوئے ایک خوبصورت کیبن میں بدی چند کا لڑکا اشونی کمار مجھے زبردستی ناشتہ کروانے پر تلا ہوا تھا۔ اشونی کمار دو تین مرتبہ ہمارے یہاں آ چکا تھا اور اپنے والد کے بعد سارا کاروبار وہی سنبھالتا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹہ بعد بدی چند اپنے ایک اور ساتھی کے ہمراہ پہنچ گیا۔ وہ آتے ہی بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے بغلگیر ہو گیا اسے میرے زندہ بچ نکلنے کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بدی چند کی زبانی معلوم ہوا کہ غلام حسین مارا گیا ہے اور باقی دونوں ساتھی گرفتار ہو گئے تھے۔ جنہیں بی ایس ایف نے آج صبح گولی مار دی تھی۔ غلام حسین کی موت کا سن کر ایک لمحے کے لیے میرا دل پھٹ گیا۔ وہ میرا بہت اچھا اور جاں نثار ساتھی تھا۔

اس رات میں اس کی وجہ سے بچ نکلا تھا ورنہ میرا بھی وہی حشر ہوتا جو میرے دوسرے ساتھیوں کا ہوا تھا۔ بدی چند کی دکان پر رکھے ہوئے فون پر قریباً ایک گھنٹے بعد میں لندن میں اپنے باس سے بات چیت کر رہا تھا۔ جب اسے سونے کے بحفاظت پہنچ جانے اور میرے بچ نکلنے کا علم ہوا تو وہ خوش ہوا۔ ہم لوگ قریباً دو ڈھائی گھنٹے وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر دوپہر کے

وقت جب میں وہاں سے نکلا تو میرا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔

میرے جسم پر تھری پیس کا بہترین سوٹ سجا ہوا تھا۔ سفید کالر والی بے داغ قمیض اور ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی، کلائی پر آٹو مینک گھڑی اور ہاتھ میں بریف کیس تھامے ہوئے جب میں نے شیشے میں اپنا سراپا دیکھا تو مجھے خود پر رشک آنے لگا۔ کس کمینے کی مجال تھی جواب مجھے چیک کرے یا میری انویسٹی گیشن کر سکے۔ دکان کے باہر ایک بڑی سی کالے رنگ کی شیورلٹ کار کھڑی تھی میرے کار میں بیٹھتے ہی شوفر نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا اور قریباً بیس منٹ بعد صفدر جنگ روڈ کی ایک عالی شان کوٹھی میں پہنچ چکا تھا۔

میرا ارادہ فوراً واپس چلے جانے کا تھا، لیکن یہاں پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق راجستھان کا بارڈر مکمل کیموفلاج ہو چکا تھا۔ بھارتی فوج سرحدوں کے ساتھ ساتھ ڈیپلائے ہو رہی تھی۔ سرد جنگ عروج پر تھی۔ کبھی کبھی مختلف علاقوں سے جھڑپوں کی اطلاعات بھی آ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے میں یہاں رکنے پر مجبور تھا۔ مجھے رہ رہ کر صرف ایک خیال پریشان کر رہا تھا کہ میں اپنے دوست کو واپس کیونکر لے جاؤں گا جو میرا منتظر تھا۔

.....☆☆☆.....

آج نومبر کی 2 تاریخ ہو گئی تھی جب کہ مجھے 10 تاریخ کو اپنے شہر بہر صورت واپس پہنچنا تھا۔ لیکن سرحدوں کی صورت حال اس امر کی متقاضی تھی کہ میں ابھی مزید یہاں قیام کروں گا۔ اسی روز شام کو ٹیلی فون پر میری اپنے باس سے گفتگو ہوئی جو اب ہانگ کانگ میں تھا۔ میں نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا اور باس نے وعدہ کر لیا کہ وہ میڈم نادرہ کے ذریعے میرے گھر والوں کو میری خیریت سے آگاہ کر دے گا کیونکہ میرے لیے اب پریشانی کی واحد وجہ میری ماں اور بہن بھائی تھے جن خطرات سے میں گزر رہا تھا ان کی میرے نزدیک اب کوئی اہمیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ باس سے گفتگو کرتے ہوئے ایک گونہ اطمینان سا ہو گیا۔

.....☆☆☆.....

میں اپنی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا کہ اب خطرے والی کوئی بات نہیں کیونکہ دہلی میں

کم از کم کسی پولیس افسر کی ہمت نہیں تھی کہ وہ بدی چند پر ہاتھ ڈال سکے۔ جس کا عملی مظاہرہ بھی میں دیکھ چکا تھا۔ ایک روز جب میں اور اشونی رات کو فلم کا آخری شو دیکھ کر واپس آ رہے تھے تو ایک جگہ پولیس کی چیکنگ پارٹی نے ہماری کار روک لی۔ میری تو ایک لمحے کے لیے جان ہی نکل گئی، لیکن دوسرے ہی لمحے جب انہوں نے کار کے اندر ٹارچ روشن کر کے اشونی کو دیکھا تو وہ سب چونک پڑے اور معذرت کرنے لگے۔

جواب میں انہیں اشونی کی ڈانٹ بھی سننا پڑی تھی، لیکن اس کے باوجود ابھی اور مشکلات منتظر تھیں جن کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم لوگ دہلی سے باہر میرٹھ روڈ پر ایک گاؤں میں جہاں بدی چند کی بہت بڑی جاگیر تھی منتقل ہو چکے تھے۔ میں یہاں سے پرسوں واپس جانے کا ارادہ رکھتا تھا، کیونکہ آج آٹھ تاریخ تھی جب کہ دس تاریخ کو مجھے اپنے والد سے ملنا تھا۔ بطور احتیاط میں اپنی جیب میں ہمیشہ ڈیڑھ دو ہزار روپے کی رقم ضرور رکھتا تھا۔

کسی بھی وقت مشکل حالات پیش آ سکتے تھے اسی روز سرِ شام اسی دیہاتی کوٹھی میں کافی ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ غالباً یہاں سے مال سرحدوں کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ میری چھٹی حس کسی آنے والے خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی میں نے اشونی سے دو تین مرتبہ کہا بھی کہ مجھے کہیں اور منتقل کر دو، لیکن وہ میری بات سن کر سوائے مسکرانے کے اور کوئی جواب نہ دیتا تھا۔

''میاں! تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، یار مسلمان تو سنا ہے ڈرتا ہی نہیں.....'' آخر اس نے تنگ آ کر کہا۔

.....☆☆☆.....

میں اس کی بات سن کر سیدھا اوپر چلا گیا اور ایک کمرے میں جو مکان کی دوسری منزل پر بنا ہوا تھا، ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ ابھی مجھے لیٹے بمشکل پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پھرتی سے موزے پہنے اور کمر کے گرد کس کر چادر باندھ لی اور اپنے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔

کمرے کی کھڑکی میں سے باہر کا سماں کسی حد تک صاف نظر آ رہا تھا۔ گاؤں کو آنے والی سڑک کا فاصلہ یہاں سے بمشکل سو گز کا ہوگا اور پولیس کے ٹرکوں سے اترے ہوئے سپاہی جو بھاگ بھاگ کر حویلی کی سمت آ رہے تھے بالکل صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے سرہانے پڑا ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

اچانک سیڑھیوں سے کسی کے اوپر آنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے ہاتھ میں سٹین گن تھامے میرے سامنے اشونی کھڑا تھا۔

''میاں! یار معاف کر دینا''

اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر اس نے پھرتی سے میرا ہاتھ پکڑا۔ سیڑھیوں کی طرف آنے والے دروازے کو کنڈی لگا دی اور ہم دونوں چھلانگ لگا کر سامنے بنے ہوئے سٹور پر کود گئے۔

سٹور کے ساتھ ہی ان مزارعوں کے مکانات تھے جو کوارٹروں کی شکل میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہم دونوں پھرتی سے ان کوارٹروں کی چھتوں پر دوڑنے لگے۔

ابھی بمشکل دو یا تین چھتیں ہی عبور کی تھیں کہ اچانک فائرنگ کی آواز آئی۔ بدی چند کے آدمیوں نے حویلی کے باہر پولیس کا راستہ روک لیا، لیکن وہ لوگ چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے، نجانے کس طرف سے ایک گولی آئی اور اشونی گر پڑا۔

اس نے پولیس کو موٹی سے گالی دی اور مجھے ایک طرف بھاگنے کا اشارہ کیا میرے ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن یہاں اس کی حیثیت کھلونے سے بھی کم تھی اشونی کہنیوں کے بل لیٹ کر فائرنگ کر رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فائرنگ کی مخالف سمت بھاگنا شروع کر دیا پھر کوارٹر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

میرے سامنے کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا میں کھیتوں میں اندھا دھند دوڑتا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے اب فائرنگ کی آواز مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ پورا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ یہ حویلی گاؤں سے کافی ہٹ کر تھی۔ میں گاؤں سے مخالف سمت بھاگ رہا

تھا۔ سڑک کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔

ٹرک یہاں سے پانچ چھ سو گز دور تھے میں نے سڑک کے ساتھ ساتھ میرٹھ کی سمت بھاگنا شروع کر دیا۔ میرے ذہن میں تمام خدشات، خوف اور خطرے حرف غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ نجانے مجھے کیوں احساس ہونے لگا تھا جیسے کوئی غیر مرئی قوت میری حفاظت کر رہی ہے، میں دو دفعہ موت کے منہ سے نکل چکا تھا اور اب خدا کی ذات پر میرا اعتقاد بہت پختہ ہو گیا تھا۔

رات کے قریباً دس بجے کا عمل تھا۔ دہلی کی سمت سے ایک بس آتی نظر آئی۔ یہ بس میرٹھ کی طرف جا رہی تھی میں نے ایک نظر اپنا جائزہ لیا۔ چادر کو کمر سے کھول کر اپنے گرد لپیٹا اور اللہ کا نام لے کر سڑک پر آن کھڑا ہوا اور میں ایک گھنٹے کے بعد میرٹھ پہنچ گیا۔

.....☆☆☆.....

وہ رات میں نے میرٹھ کے باہر ایک ویران مسجد میں گزاری جو بالکل سنسان اور اکیلی سب سے الگ تھلگ اپنے بنانے والوں کی بے بسی کا ماتم کر رہی تھی۔ صبح اٹھ کر میں نے دوبارہ گنگا نگر کا راستہ پکڑا۔

آج میں گنگا نگر کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے کے بس سٹاپ پر اپنے دوست کا منتظر تھا۔ صبح کے قریباً دس بجنے والے تھے میں بڑی بے چینی سے چائے کے ایک کھوکھے پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اس کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ یہ ''دوست'' بھی ہمارے ''کلب'' کا ممبر تھا اور واپسی پر ہمیں اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جانا تھا پہلے تو دل نے کہا کہ جائے جہنم میں..... مجھے کچھ اپنی خبر نہیں خود مصیبت میں پھنسا ہوں۔

لیکن..... دوسرے ہی لمحے میں نے اس سوچ کو جھٹک دیا۔ عین ممکن تھا کہ قدرت نے مجھے ابھی تک اس لیے زندہ رکھا ہو کہ میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں.....

مجھے اس ''دوست'' کی شناخت نہیں بتائی گئی تھی ہم نے ایک دوسرے کو مخصوص کوڈ ورڈز کے ذریعے ہی شناخت کرنا تھا۔

میرے دل میں ہزاروں وسوسے جنم لے رہے تھے۔ بار ہا یہی خیال پریشان کئے دے رہا تھا "خدانخواستہ کہیں وہ....." اس کے آگے میری سوچ منجمد ہو کر رہ جاتی۔ میں بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک میرے ساتھ قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے جو کسی بہبن گھرانے کا بگڑا ہوا فرزند نظر آتا تھا مجھ سے پوچھا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے مہاراج جی.....؟"

میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ ہمارا کوڈ ورڈ یہی تھا۔

جواباً میں نے اس سے کچھ کہا اور اپنے اطمینان کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔

میرے وہاں سے اٹھنے کے ایک دو منٹ بعد ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا میں سڑک کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر سفر کر رہا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا قریباً ایک میل چلنے کے بعد ہم اکٹھے ہو گئے!

"ویر جی.....گنگا نگر تو فوج آ گئی ہے.....!"

"ہم دوسری جگہ سے کراس کریں گے....."

میں نے اسے کہا۔

ہم لوگ مقامی لاریوں کے ذریعے ابوہر پہنچے اور وہاں سے گیدڑ بہا پہنچ گئے گیدڑ بہا ایک چھوٹا سا قصبہ نما گاؤں ہے جو بارڈر سے بالکل قریب واقع ہے اس وقت رات کے قریباً آٹھ بج رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ بارڈر گشت شروع ہو چکی تھی۔ میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ غلام حسین کے ساتھ یہ بارڈر پار کیا تھا۔

آج سے قریباً دو ماہ پہلے اس جگہ کا ہلکا سا نقشہ اب بھی میرے ذہن میں موجود تھا اسی یادداشت کے سہارے میں یہاں چلا آیا تھا۔ ورنہ مجھے اس بارڈر کے متعلق ذرا بھی معلومات نہیں تھیں۔

ہم لوگ بارڈر کے قریب ہی ایک کھیت میں چھپے بیٹھے تھے۔ میں اپنے ساتھی کو یہ بتا کر خواہ نخواہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میری معلومات اس علاقے کے متعلق بالکل صفر ہیں۔

میں صرف اتنا جانتا تھا کہ سامنے میرا علاقہ ہے لیکن بارڈر کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ اپنی دانست میں بارڈر عبور کر رہے ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں مخالف علاقے کی کسی پوسٹ میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں۔

.....☆☆☆.....

"چلئے ویر جی.....!"

میرا دوست اپنے علاقے میں داخل ہونے کے لیے بے چین تھا۔

"صبح دم انشاء اللہ چلیں گے۔ اب گشت گزر جانے دو۔"

میں نے اطمینان سے سرگوشی میں کہا۔

میرے استاد نے بتایا تھا۔ بیٹا جب کبھی مخالف علاقے میں بارڈر کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاؤ تو صبح کے وقت نکلنے والے ستارے کو جسے ہم لوگ قطب ستارہ کہتے ہیں اپنے دائیں کندھے پر رکھ کر چلنا شروع کر دینا تم اپنے علاقے میں پہنچ جاؤ گے۔ اس بات کا خیال رہے کہ ستارہ بائیں طرف نہ آنے پائے۔

میں قطب ستارے کا منتظر تھا جس بے چینی سے وہ رات ہم نے کاٹی وہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

صبح سویرے میں نے خدا کا نام لیا اور کھیتوں سے باہر بڑی احتیاط سے قدم نکالا۔ ہمارے سامنے اب کھلا علاقہ تھا۔ ہم قطب ستارے کی سمت لے کر چلتے رہے۔ قریباً پندرہ منٹ ہی چلے ہوں گے کہ اچانک سامنے کوئی سفید سی چیز نظر آئی ہم دونوں فوراً لیٹ گئے، لیکن وہ چیز بے حس و حرکت کھڑی رہی ہمیں اپنے خوف پر خود ہی ہنسی آ گئی یہ تو بارڈر کی حد والی برجی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے ہمارے قدم اپنے علاقے کی زمین پر تھے۔

.....☆☆☆.....

اس مرتبہ واپسی پر میاں صاحب نے مجھے بطور خاص اپنے دولت خانے پر طلب کیا، مجھے زبردست شاباش دی اور ایک خطیر رقم انعام میں دے کر بیس روز تک آرام کرنے کا حکم دیا۔

''لندن والے باس'' کے ذریعے ان تک ایک ایک لمحے کی کہانی پہنچ چکی تھی۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ میرے ساتھ آنے والا ''دوست'' ان کا قریبی عزیز تھا۔ جو ایک عرصے سے آر پار آجا رہا تھا لیکن اکیلا نہیں بلکہ کسی کی مدد سے۔

عموماً یہ کام غلام حسین کے ذریعے ہوتا تھا جو آج میں نے کر دکھایا۔

میاں صاحب کے خیال میں مجھے اب آرام کی ضرورت تھی شاید اس کے بعد وہ مجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتے تھے۔

.....☆☆☆.....

قریباً پندرہ بیس روز شراب و شباب کی رنگینیوں میں غرق رہنے کے بعد ایک روز میں پھر ایک اہم مشن پر جا رہا تھا۔ یہ مشن اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا خطرناک تھا کہ میں نے پہلے ہی اپنی ماں کو کہہ دیا تھا۔ شاید مجھے ایک لمبے عرصے تک گھر سے باہر رہنا پڑے کیونکہ اپنی مالکن کے ساتھ ملک سے باہر جا رہا ہوں..... نجانے یہ بات میں نے کیوں اپنی ماں سے کہی تھی۔

برائی کے جو جراثیم میری رگوں میں زہر بن کر سرایت کر رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک میرے دل کو ماں کے احترام سے خالی نہیں ہونے دیا تھا۔

میں سرحد پر سمگلنگ کا مال لینے اور انڈین سمگلروں سے خصوصی ملاقات کرنے جا رہا تھا گو کہ اب یہ میرا معمول تھا لیکن شاید یہ خصوصی مہم تھی..... اور اپنی خصوصی اہمیت کا مجھے بخوبی احساس تھا۔ اس کے علاوہ اب مسز نادرہ سے میرے مراسم ایسے تھے کہ اس کے کسی حکم کو میں ٹال نہیں سکتا اور مسز نادرہ کی یہ حالت تھی کہ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگی تھی۔

گزشتہ تین چار ماہ سے اپنے گروہ کے ساتھ پے در پے حادثات نے اسے یقین دلایا دیا تھا کہ کوئی گھر کا راون ہی ان کی لنکا ڈھانے پر تلا ہوا ہے۔

اس کے ذہن میں پرانے کارکنوں کے متعلق شبہات نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مجھ پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی تھی۔ اس لیے اس مرتبہ سرحد جس علاقے سے عبور کرنی تھی وہ میرے لیے اجنبی تھا۔

ہم لوگ سرِ شام ایک گاؤں میں پہنچ چکے تھے جہاں ہماری آمد سے دو روز پہلے ہی وہ مال

پہنچ چکا تھا۔ میرے ساتھ بیگم نادرہ کے حکم پر دو باڈی گارڈ جا رہے تھے۔ یہ لوگ شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش تھے جنہوں نے پولیس کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ایسے کئی بدمعاش میری مالکن مسز نادرہ کے معمولی حکم پر کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے چلے آتے تھے۔ وہ اس کے لیے کوئی کارنامہ انجام دینا کسی سعادت سے کم نہیں جانتے تھے۔

بدمعاشوں کی اپنی ایک ذہنیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ عموماً اپنے سے بڑے بدمعاش کا ہی احترام کرتے ہیں اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، لیکن انہیں ایسی بریفنگ دی گئی تھی کہ میرے سامنے ان کی حالت وہی ہو رہی تھی جو سرکس کے شیروں کی اپنے رنگ ماسٹر کے سامنے ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہنٹر ان شیروں کو بھی گیدڑ بنا دیا کرتا ہے۔ دونوں بدمعاش میرے ساتھ بڑی شرافت اور شائستگی سے پیش آ رہے تھے۔

عموماً ہوتا یہی تھا کہ جہاں کہیں ہمیں کوئی بھی ''واردات'' کرنی ہوتی۔ وہاں پہلے ہی ا سے پولیس کو ہاتھ میں لے لیا جاتا۔ لالچ، دھمکی، خوف، دباؤ یا کسی بھی اور ذریعے سے۔

لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔

بہرحال ایمان دار لوگ بھی اسی ملک میں پائے جاتے ہیں اور اس مرتبہ بھی یہی ہوا کہ علاقے میں کچھ ایماندار لوگ بھی آ گئے۔ جبکہ بیگم نادرہ اور اس کے گروہ کے لوگوں کا اس نظریے پر سے شاید ایمان ہی اٹھ چکا تھا وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی مائی کا لال ان کے تمام ''ہتھکنڈوں'' کو پائے حقارت سے ٹھکرا سکتا ہے۔

رات کے پہلے پہر ہم نے سرحد پر جانا تھا۔ ان دونوں کے لیے سرحدوں کے آر پار آنا جانا بچوں کا کھیل تھا وہ ایسے کئی کارنامے پہلے ہی انجام دے چکے تھے اور سرحد کی طرف کسی غلط ارادے سے میرے قدم بھی پہلی مرتبہ نہیں اٹھ رہے تھے۔

.....☆☆☆.....

مجھے یہاں اسرار و رموز سے بالکل آگاہی تھی۔ بیگم نادرہ کا حکم تھا اور مجھے تعمیل کرنی تھی۔ جس جگہ سے ہم نے مال اٹھانا تھا وہاں موجود کارندے نے مجھے ایک طرف لے جا کر اس

سرحد سے متعلق چند ابتدائی نوعیت کی معلومات ضرور بہم پہنچائی تھیں، جو ناکافی تھیں اور آج طویل عرصہ بعد پہلی مرتبہ میں خوفزدہ تھا۔ ابھی چند روز پہلے میں بمشکل جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سرحد عبور نہیں کروں گا۔

یوں بھی یہاں کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ ابھی تک میرے اعصاب ہی میرے مکمل اختیار میں نہیں آ رہے تھے۔ اندھیرے میں چلائی جانے والی گولی اپنا شکار خود ہی منتخب کرتی ہے۔ اور یہاں معمولی آہٹ پر گولیوں کا مینہ برسنے لگتا تھا۔

ہمیں تو یہی یقین دلایا گیا تھا اور سابقہ تجربہ بھی بتا رہا تھا کہ سنگین نوعیت کی صورت حال سے دوچار نہیں ہوں گے لیکن ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کوئی ہمارے استقبال کے لیے پہلے سے ہی موجود ہے۔ ہمارے لیے رینجرز نے ''سپیشل ناکے'' لگائے تھے۔ انہیں معلوم تھا موٹی پارٹی ہے۔ مقامی پوسٹ کو خرید لے گی وہ کوئی موقع اس مرتبہ ہمیں دینا ہی نہیں چاہتے تھے۔

ہم مطمئن اپنی منزل کی طرف گامزن تھے میرے ساتھیوں نے اپنے سروں پر دو بوریاں اٹھا رکھی تھیں اور وہ میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان دونوں کے آگے ہمارا رہبر تھا، جو ایک مقامی آدمی تھا اور سرحد کے چپے چپے کا اس کو بخوبی علم تھا اس نے بھی ایک تھیلا اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ ہم لوگوں کو سرحد کی دوسری طرف نزدیک ہی ایک ٹیوب ویل تک جانا تھا۔ جہاں ہماری ''اٹ'' لگی ہوئی تھی۔

''اٹ'' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سمگلر آپس میں ملاپ کرتے ہیں اور مال کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ عموماً ہوتا یہی ہے کہ دونوں اطراف کے سمگلر اپنی مقامی سرحدی پوسٹ سے پہلے ہی سودا بازی کر کے ''اٹ'' لگاتے ہیں۔

جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، ایک بے نام سا خوف میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر کے سارے جسم میں رینگتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف پر ہول سناٹا طاری تھا۔ کبھی کسی جنگلی جانور کی آواز سنائی دیتی تو یوں لگتا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر زور سے دبا دیا ہو۔

ہم سرحد سے کچھ دور ہی تھے جب میں نے ایک عجیب سی آواز سنی۔ جو کسی مقامی جانور سے مشابہ تھی۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ یہ ایک طرح کا سگنل تھا جو "شکار" نظر آنے پر رینجرز دیا کرتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

ایک انجانی طاقت بار بار مجھے خطرے کا احساس دلا رہی تھی، لیکن میں نے اس کی پرواہ نہ کی اور اسے اپنا واہمہ جان کر نظر انداز کر دیا حالانکہ یہ حقیقت تھی۔ جس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

ابھی ہم "اٹ" سے کافی دور ہی تھے کہ اچانک ایک گونج دار آواز سنائی دی۔

"ہالٹ"

میں تو لرز کر رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی دوسری "ہالٹ" کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ ہمیں گھیرے میں لے کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کا حکم دے رہے تھے..... یہ بھی ان کی مہربانی تھی ورنہ یہ لوگ بغیر للکارے گولی مار دیا کرتے تھے۔

اس سے پہلے کہ مجھے حالات کو سمجھنے کی مہلت ملے۔ ہمارے راہبر نے اچانک ایک طرف فائرنگ شروع کر دی۔ شاید وہ اس طرف فائرنگ کر رہا تھا جس طرف سے ہمیں للکارا گیا تھا پھر نہ جانے کس طاقت نے مجھے اٹھا کر اس جگہ سے کچھ فاصلے پر پھینک دیا کیونکہ جیسے ہی میں نے چھلانگ لگائی۔ کئی گولیاں میرے جسم کے قریب سے گزر گئیں۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اب شاید ان لوگوں کی آپس میں ٹھن گئی تھی کیونکہ میرے دونوں ساتھیوں نے بھی بوریاں نیچے پھینک کر سٹین گنیں سنبھال لی تھیں اور وہ بڑی دلیری سے رینجرز کا مقابلہ کر رہے تھے۔

جیسے ہی میں زمین پر گرا ایسا محسوس ہوا جیسے ہزاروں چیونٹیاں میرے جسم میں سرایت کر گئی ہوں۔ اس علاقے میں لگی بے شمار کانٹے دار جھاڑیاں میرے جسم میں گھس گئی تھیں۔ میں نے ایک لمحے کے لیے ان کی اذیت کو محسوس کیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے موت کا خوف تمام

محسوسات پر غالب آ گیا۔

میں اندھا دھند ایک طرف منہ اٹھا کر بھاگنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر موت نے مجھ پر گرفت کی تھی۔ میرے دل و دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ قدرت کی طرف سے مجھے سزا دینے کا فیصلہ ہو گیا ہے کیونکہ میں نے اس سے پہلی والی وارننگ کو نظر انداز کر دیا تھا۔

.....☆☆☆.....

میں دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ فاصلوں اور سمت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ ذہن میں صرف ایک بات سمائی ہوئی تھی کہ مجھے خطرے سے دور ہو جانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دور..... ورنہ میں انڈین بی ایس ایف (بارڈر سکیورٹی فورس) کے ہتھے چڑھ جاتا اور پھر.....

اس سے آگے کسی بات کا تصور بڑا ہی اذیت ناک تھا۔ گو کہ اب جرائم کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہیں رہا تھا۔ میں نے کئی مہمات انجام دی تھیں لیکن دو ملکوں کی حکومتوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کوئی کام کرنا واقعی مہنگا تجربہ ثابت ہوا تھا اور جب پہلی ہی جرأت پر یہ واقعہ پیش آ گیا تو ظاہر ہے مجھے دوبارہ اس طرف نہیں آنا چاہیے تھے۔

فائرنگ کی آواز دور ہوتے ہوئے اب آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگی تھی۔ میں کتنی دور نکل آیا تھا کس سمت میں جا رہا تھا، کچھ خبر نہیں تھی۔ میرے جیب میں کچھ پاکستانی کرنسی تھی یا پھر معمولی سا پستول۔ آج سے چند روز پہلے کے واقعات مجھے ڈراؤنے خواب کی طرح یاد آ رہے تھے اور مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی نادیدہ قوت بار بار مجھے یاد دہانی کروا رہی تھی کہ اللہ کی طرف سے گزشتہ وارننگ کو نظر انداز کرنے کی سزا مل رہی تھی۔ میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

ذرا ہوش آیا تو خود کو کھیتوں کے ایک وسیع سلسلے میں گھرا پایا۔

مجھے اس بات کا علم تھا کہ رات کو ایسے کھلے سرحدی علاقے میں کوئی سمت کا تعین کیے بغیر بھاگنا شروع کر دے تو اکثر کولہو کے بیل کی طرح یا تو ایک ہی مقام پر چکر لگاتا رہے گا یا پھر اپنے اندازوں کے بالکل برعکس کسی اور طرف جا نکلے گا۔

جس رفتار سے میں بھاگا جا رہا تھا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ تو بخوبی ہو چلا تھا کہ میں نے

کم از کم چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ لیکن میرے سمت کونسی ہے؟ میں پاکستانی سرحد کی طرف بھاگ رہا ہوں یا بھارتی سرحد کے اندر جا رہا ہوں اس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا۔

تعاقب میں آنے والی فائرنگ کی آواز اب مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو چکی تھی۔ شاید مقابلہ کرنے والے مارے گئے تھے یا انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے تھے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ رک کر پہلے حالات کا جائزہ لے لوں۔

سرحد عبور کرتے وقت ہمارا لباس دیہاتیوں جیسا تھا۔ میں نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ کرتا پہن رکھا تھا اور ایک گرم چادر میرے کندھے پر دھری تھی۔ پاؤں میں دیہاتیوں جیسی جوتی پہنی ہوئی تھی۔

پستول میں نے اپنی ''ڈب'' میں رکھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کا جائزہ لیا اور یہ انکشاف مجھ پر ٹائم بم کی طرح پھٹا کہ بھاگ دوڑ میں پستول بھی کہیں گر گیا ہے..... گویا میں اب انسانوں کے علاوہ جنگلی درندوں کی غذا بھی بن سکتا ہوں۔

میں کماد کے کھیت کے قریباً درمیان میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس غلطی کے احساس نے میری گھبراہٹ میں مزید اضافہ کر دیا۔ عموماً کماد کے کھیتوں میں سور گھس آیا کرتے ہیں۔ اس یت کے گرد تو حفاظتی باڑ بھی نہیں لگائی تھی۔ مجھے ہمارے مقامی کارندے نے خاص طور سے اس علاقے میں پائے جانے والے جانوروں اور ان کی عادات سے آگاہ کیا تھا۔

دونوں اطراف کے کسان اس موذی جانور کے حملوں سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے اور اپنے کھیتوں کے گرد خاردار تاریں لگا کر رکھا کرتے تھے تاکہ سور ان میں داخل نہ ہو سکیں۔

''اف میرے خدایا''

میں نے سوچا۔

اگر اس موذی جانور نے کھیتوں میں گھسنے کا ارادہ کر ہی لیا تو میں اس کا مقابلہ کیسے کر پاؤں گا؟ ابھی تک چادر میرے کندھے پر نجانے کیسے محفوظ رہ گئی تھی۔ شاید بھاگتے ہوئے میں نے لاشعوری طور پر اسے اپنی بغل میں دبا لیا تھا۔

میں بے دم سا ہو کر وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ رہا.....!

کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں، کدھر جاؤں۔

یہاں سے باہر نکل کر پھر ایسا محفوظ ٹھکانہ میسر آئے گا یا نہیں؟ یہ سوچ کر یہاں سے باہر نکلنے اور خواہ مخواہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کافی دیر تک سوچنے کے بعد وہیں بیٹھ رہنے ''انتظار کرنے اور دیکھنے'' کا فیصلہ کر لیا۔ خواہ یہ کوئی بھی علاقہ ہو میں زیادہ دور تک جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

ابھی وہیں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک جسم میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ یہ ان کانٹوں کا کمال تھا جو بھاگتے وقت میرے جسم میں چبھ گئے تھے۔ میں نے متاثرہ جگہوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر کر کانٹے تلاش کرنے اور نکالنے شروع کر دیئے۔

یہ عمل خاصا تکلیف دہ تو تھا لیکن وقت گزاری کا ایک اچھا بہانہ بھی میرے ہاتھ آ گیا تھا اور میرا ذہن بس یکسوئی کے ساتھ ایک طرف ٹک چکا تھا۔

یہاں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ میں حالات کتنے ہی کیوں نہ خراب ہوں اپنے حواس ضرور برقرار رکھوں، اپنے اعصاب کو ٹوٹنے سے بچائے رکھوں۔ تب ہی ان حالات سے نمٹنے کی کوئی صورت نکل سکتی تھی۔ بصورت دیگر میرے بچ کر نکل جانے کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔ فی الوقت مجھے انسانوں اور درندوں سے بچنا تھا۔

سپیدہ سحر آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگا تھا۔ حد نظر مجھے سرخ رنگ کا ایک ایسا ہالہ زمین سے پھوٹ کر آسمان کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹتا نظر آ رہا تھا۔ ذرا تحفظ کا احساس ہوا تو پیاس نے ستانا شروع کر دیا مسلسل بھاگ دوڑ سے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔

.....☆☆☆.....

کسی بھی لمحے جنگلی جانوروں کے کسی آوارہ غول کے اس طرف آ نکلنے اور اس کھیت پر حملہ آور ہونے کا خطرہ الگ میرے ذہن میں سوار تھا۔ عموماً کھیتوں کے باہر منڈیر کنارے لگے درختوں کے نیچے جہاں کسان دن میں چارپائیاں بچھا کر ستاتے رہتے وہاں پانی کا گھڑا موجود

رہتا ہے۔

جی میں آئی کہ اس کھیت کے منڈیروں تک پہنچنے کی کوشش کروں لیکن انسانوں سے زیادہ جنگلی جانوروں کے خوف نے وہیں دم دبا کر بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس بات کے کتنے فیصد امکانات تھے کہ یہاں کوئی پانی کا گھڑا موجود بھی ہوگا یا نہیں؟

میرے نزدیک سے وہ نالی کھیتوں کے بیچوں بیچ گزر رہی تھی جس سے پانی گزر کر پودوں تک پہنچتا ہے۔ شاید آج یا کل یہاں پانی لگایا گیا تھا اور ابھی تک کچھ گدلا پانی اس نالی میں موجود تھا۔ عام حالات میں تو اس جگہ سے کوئی جانور بھی پانی پینے کا روادار نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن یہ نظام قدرت ہے کہ وہ بڑے بڑے وحشی انسانوں کو کبھی بھیڑ کے میمنے سے بھی زیادہ بے بس کر دیا کرتی ہے۔

میری حالت پیاس کے مارے اتنی بری تھی کہ اگر تھوڑی دیر تک اور پانی کا گھونٹ میرے حلق میں نہ جاتا تو میرا حلق بھی شاید ہمیشہ کے لیے سوکھ جاتا۔

میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر جانوروں کی طرح اس نالی سے پانی پیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس گدلے پانی کو پینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں پانی سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس روز مجھے یہ پانی ''سکاچ'' سے زیادہ مزہ دے رہا تھا۔ بہت عرصے کے بعد میرے منہ سے پہلی مرتبہ ''الحمدللہ'' نکلا۔

حالات کے ایک ہی جھٹکے نے مجھے بھولا ہوا خدا یاد دلا دیا تھا۔

.....☆☆☆.....

وہاں قریب شاید کوئی گاؤں تھا۔ دور ٹمٹماتے دو تین بجلی کے قمقموں نے مجھے اس بات کا احساس دلایا۔ مجھے ابھی تک یہ علم نہیں ہو پایا تھا کہ یہ علاقہ کون سا ہے بھارتی یا پاکستانی۔

دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یہ پاکستان کا علاقہ ہو۔ میرے لیے یوں تو صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہچان کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا پہچان کا کہ صبح دم یہاں

سے بلند ہونے والی پکار مجھے بتا دیتی کہ میں کہاں ہوں۔ اگر یہ پاکستانی دیہات تھا تو جلد ہی اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہونے والی تھیں..... اگر خدانخواستہ یہ بھارتی گاؤں ہے تو ان لوگوں کے مذاہب سے متعلق پوجا پاٹھ کی آواز آتی اور وہ بھی اس کے لیے ایمپلی فائر ضرور استعمال کرتے۔

بڑی بے قراری سے میں اس ساعت کا منتظر تھا جس نے نمودار ہو کر میری قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔

بالآخر وہ گھڑی بھی آ ہی گئی جب مجھے زبردست ذہنی دھچکے نے ہلا کر رکھ دیا۔ قریبی گاؤں سے لاؤڈ سپیکر کی آواز آ رہی تھی۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ نہ لگی۔ لیکن جب آواز خاصی واضح ہو گئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں بری طرح پھنس چکا ہوں۔ قریبی گاؤں کے شاید کسی مندر یا گوردوارے سے پوجا پاٹھ کے لیے گائے جانے والے بھجنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ زور زور سے بجنے والے ہارمونیم اور ڈھولک کی آوازوں کے ساتھ مل کر کورس کی شکل میں بھجن ہی گائے جا سکتے تھے۔

تازہ صدمے نے میری کرہمت بھی توڑ کر رکھ دی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً جواب دینے لگے تھے۔

دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو قدرت مجھے سزا دینے پر تل گئی تھی یا پھر مجھے نصیحت دینے اور گناہوں کی اس کال کوٹھری کو خیرباد کہہ دینے کا سامان بہم پہنچا رہی تھی۔ جانے کس اضطراری کیفیت کے تحت میں اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

صدمے اور تکلیف سے میری حالت غیر تھی۔ ایک ایک قدم من من کا بوجھل ہو رہا تھا اور بمشکل میں نزدیکی کھیت تک پہنچ پایا۔ جہاں قدرے امان میسر تھی۔

وہاں ایک ٹیوب ویل نظر آنے لگا تھا۔ جس کے نزدیکی کمرے میں کسی وقت بھی کسی کی آمد متوقع تھی۔ میں ڈرتا ڈرتا اس کماد کے لمبے چوڑے کھیت کے شاید عین درمیان پہنچ چکا تھا۔ یہاں کم از کم مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں باہر سے دیکھنے پر نظر نہیں آ سکتا۔ اگر کوئی اندر ہی چلا آئے تو دوسری بات ہے لیکن اندر آنے والی بات ذرا مشکل ہی دکھائی دیتی تھی کیونکہ ابھی کٹائی کا

موسم نہیں آیا تھا۔ کھیت کے عین درمیان ایک جگہ پر چادر بچھا کر میں اس پر بے سدھ ہو کر گر پڑا۔

اس لمحے سب سے پہلے اس بات پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں جنگلی جانوروں سے تو محفوظ رہا۔ اپنی بے بسی کے احساس نے مجھے رلا ڈالا۔

آج شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی شدت کے ساتھ مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں گناہ گار ہوں اور اتنی دولت اور عیاشیوں میں رہتے ہوئے بھی بالکل بے بس ہوں۔

میرا باپ جیل میں قید تھا!

میری بوڑھی ماں بیمار تھی!

میں جوان بہن کا بھائی تھا!

میرا چھوٹا بھائی ابھی گھر سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔

اور میں.....!!

یہاں بھارت کے ایک ایسے سرحدی علاقے میں جس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ بے یار و مددگار ایک کینچوے سے بھی زیادہ بے بسی کی حالت میں پڑا اس خدا سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا جسے میں نے یاد کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اف میرے خدایا! یہ سب کیا تھا! کیوں ہو گیا؟ میں نے گزشتہ واقعہ ہی سے نصیحت کیوں نہ حاصل کی۔

.....☆☆☆.....

جب میں نے اس سوال پر غور کیا تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا۔ مجھے اپنی تمام سیاہ کاریاں یاد آنے لگیں۔ میڈم نے مجھے درندہ بنا ڈالا تھا۔ اس خوبصورت ناگن کے پھیلائے زہر نے میری انسانیت کو اندر ہی اندر ڈس لیا تھا۔

مجھے ایک سیدھے سادے نوجوان کو حالات نے کیسی کیسی پٹخنیاں دی تھیں۔ میں کہ جس نے گناہوں کی دلدل میں قدم رکھتے ہی خود کو محفوظ جان کر ہواؤں میں اڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس روز مجھے اپنا آپ بالکل کھوکھلا..... خالی خالی..... محسوس ہونے لگا۔ میرا دل بھر آیا تھا اور میں بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا۔ آنسوؤں نے شاید اندر کی سیاہی کو دھو ڈالا تھا۔ اسی لیے

تو مجھے اپنا آپ بالکل ہلکا محسوس ہوا تھا۔

رونے سے شاید میرے اعصاب پر سوار خوف بھی دھل کر میرے آنسوؤں کے ساتھ ہی کہیں بہہ گیا تھا۔

اب میرے ذہن میں خوف نام کی کسی شے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مجھے تو میرے اندر کے انسان نے رلا دیا تھا۔ میں کہ جس نے اپنے ضمیر، ماں کی تربیت اور دعاؤں کو اپنے اندر سے اپنی دانست میں مار ہی ڈالا تھا۔ لاشعور کے کسی تاریک گوشے میں دفن کر دیا تھا۔ مجھ ناکس کو قدرت نے ایک معمولی سے جھٹکے ہی میں میرے کھوکھلے اور میڈم نادرہ کی طرف سے ذہن میں انجکٹ کیے خیالات سمیت زمین بوس کر دیا تھا۔

اس لمحے مجھے حالات سے زیادہ اپنی بے بسی پر رونا آیا کہ جب میں نے اپنی محرومیوں کو ختم کرنے کے لیے دولت حاصل کر لی تو میں انسانیت سے محروم ہو گیا۔ کتنی تشنگی تھی۔ کتنی بے بسی تھی؟ کتنا مجبور ہے انسان؟

یہاں مجھے میری دولت، میری عیاشیاں، میڈم، ہمارے گروہ کے بااثر حرام خور کوئی بھی تو نہیں بچا سکتا تھا.....

لیکن ایک ہستی تھی اور وہ تھی میری ماں۔

.....☆☆☆.....

کوئی طاقت اندر ہی اندر مجھے اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ میری ماں کی مانگی ہوئی دعائیں کبھی ضائع نہیں جائیں گی۔ کہیں پھر میں نے سوچا اگر میری ماں کی دعاؤں میں اثر ہوتا تو میں یہاں تک آتا ہی کیوں؟

حالات کے ہاتھوں موم کی گڑیا بنتا ہی کیوں؟

میرے پاس کوئی ایسا قابل عمل نظریہ اس وقت موجود نہیں تھا جو میرے ذہنی بحران کو خواب آور گولی کی طرح سکھ چین کی نیند کا نذرانہ دے سکتا۔ مجھے مذہب وراثت میں ملا تھا لیکن میں نے اس کا استعمال شاید نہیں سیکھا تھا۔ سچے عقائد کے مضبوط ہتھیار سے میں نے خود کو اچھی

طرح مسلح نہیں کیا تھا کہ خود پر حملہ آور ہونے والے فرسودہ فلسفہ کے سامنے عقائد کی ڈھال کھڑی کر کے اس حملے کا دفاع کر سکوں۔

لیکن میں نے زندگی بھر منفی نکتہ نظر ہی نہیں اپنایا تھا، ہزار گنگھور اندھیروں میں گھر جانے کے باوجود ابھی تک میرے اندر کہیں نہ کہیں روشنی کی ایک کرن چاہے اس کی حیثیت اندھیری رات میں ٹمٹماتے دیئے جتنی بھی نہیں تھی، بہر حال ضرور موجود تھی۔ جو کبھی کبھی تو عین ان لمحوں میں میرے اندر چکا چوند کر دیا کرتی تھی۔ جب میں بظاہر اس کو فراموش کر چکا ہوتا تھا تب میڈم میری موم کی گرون مروڑ کر مجھے پھر سیاہ کاریوں کے جہنم میں دھکیل دیتی تھی۔

میری ذہنی شکست و ریخت نے میرے اندر کبھی کسی نظریے کو خواہ وہ مثبت تھا یا منفی پائیدار ہونے ہی نہیں دیا جب کبھی اس نے میرے وجود میں گھر کرنے کی کوشش کی میرے وجدان نے کان سے پکڑ کر اسے باہر نکال دیا۔

میں حدود میں مقید آزاد فضاؤں کا متلاشی ورندہ بن چکا تھا!

میں نے اپنی زندگی کو فیصل آباد کا گھنٹہ گھر بنا کر رکھ دیا تھا۔ جس جس پگڈنڈی سے بھی گزرتا وہ مجھے واپس اسی شاہراہ پر لے آتی جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

میری حالت کولہو میں جتے اس بیل کی طرح تھی جس کی آنکھوں پر چمڑے کے خول چڑھا کر چھڑی کی ایک ضرب لگا کر اسے رہٹ کے گرد چکر لگانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بیل تب تک اپنے کام میں مصروف رہتا ہے جب تک اس کا مالک اس کی لگامیں کھینچ کر اسے روک نہ لے۔

حالات کی ستم ظریفی کہ میری لگامیں بھی میڈم نادرہ جیسی عورت کو سونپ دیں جس کے ساتھ رہتے ہوئے میرے نزدیک ہر جھوٹ سچ تھا اور ہر سچ مجھے جھوٹ دکھائی دینے لگا تھا۔

کاش مجھے اس وقت علم ہو جاتا کہ بالآخر ہر فلسفہ قناعت پر ختم ہوتا ہے۔ ہر مرحلے کے

آگے صبر کی کڑی منزل آتی ہے۔ زندگی سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے مجھے کم از کم اپنی ماں جیسا صبر درکار تھا۔ میرے پاس تو اس کی زندہ مثال موجود تھی لیکن افسوس تو اسی بات کا تھا کہ میں نے اپنا معیار بدل لیا۔

میں اپنی غلطی کا ادراک تو کر سکتا تھا لیکن میرے ذہن کی پوتھی میں کوئی ایسا فلسفہ محفوظ نہیں تھا کہ خود کو مطمئن بھی کر لوں۔ میں اپنی عیادت کر سکتا تھا لیکن اپنا علاج کرنے سے قاصر تھا!

جب خیالات کے ہجوم نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ کر اچھی طرح رلا لیا تو میری ماں کی ذہنی تربیت جسے میں اپنی دانست میں مار کر لاشعور کے کسی گوشے میں دفن کر دیا تھا نے زندہ پیر کی طرح بیدار ہو کر میری ہمت افزائی کی اور مجھے اندر ہی اندر ایک سکون، ایک طمانیت کا احساس دلا دیا میں نے خود ہی اپنے آپ کو حوصلہ دیا۔ اپنے آنسو پونچھے۔

سچے دل سے توبہ کی اور آئندہ کبھی بھول کر بھی اس راستے پر نہ آنے کا اللہ تعالیٰ کے حضور بالکل ہی اور آخری فیصلہ کر لیا۔ میں نے خدا کے حضور عہد کر لیا تھا کہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہنے کی مجھے خواہ کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے میں اس سے اب قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔

جب میں نے اپنے آپ کو خدائے بزرگ و برتر کے حضور سونپ دیا تو میں اس حالت سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ میں نے چادر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے کو مختلف پٹیوں کی شکل میں پھاڑا اور انہیں جسم کے مختلف حصوں پر باندھ لیا۔ شاید اس طرح کچھ سکون حاصل ہو، کیونکہ زہریلے کانٹوں نے میرے بدن سے خوب خوب حساب چکایا تھا، پھر وہیں لیٹے لیٹے میں نے تین چار گنے توڑے اور انہیں چوس لیا۔

اس اثناء میں قریب ہی سے ایک ٹریکٹر کی آواز سنائی دینے لگی۔ لیکن وہ آواز بھی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی۔ کیونکہ میں نیند کی دیوی کی بانہوں میں جھولنے لگا تھا۔

کچھ علم نہیں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو سورج سر پر چمک رہا تھا۔ جسم پسینے

سے شرابور تھا۔ گرمی تو کوئی ایسی نہیں تھی لیکن مجھے بخار کی سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔

پیاس کے مارے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور بھوک سے کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ جب اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو میرے منہ سے بے ساختہ ''ہائے'' نکل گئی۔ نہ جانے جسم کے کس حصے سے ایک ٹیس اٹھی اور سارے وجود میں پھیل گئی۔

میں نے سب سے پہلے تو قریب رکھا صبح کا بچا ہوا باقی آدھا گنا چوسا جب کسی حد تک پیاس کم ہوئی تو آہستہ آہستہ کھیت کے ایک کنارے کی طرف سرکنے لگا۔

.....☆☆☆.....

قدرت کو اب شاید میری حالت پر رحم آنے لگا تھا کیونکہ اس نے خود ہی میری بھوک کا بندوبست کر دیا تھا، کھیت کے ایک کنارے میں نے سامنے گاؤں سے آنے والی پگڈنڈی کی طرف نظر دوڑائی تو قریبی گاؤں کی عورتیں اس طرف آتی نظر آئیں۔

انہوں نے اپنے سروں پر دیہاتوں کے روایتی طریق کے مطابق لسی کے برتن اٹھا رکھے تھے اور ہاتھوں میں شاید روٹی پکڑی ہوئی تھی جو انہوں نے برتنوں میں ڈال کر رومالوں میں لپیٹ رکھی تھی۔ اس وقت عموماً دیہاتی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے والے افراد خانہ کے لیے گھر سے روٹی لے کر آیا کرتی تھیں۔

میرے سامنے ٹیوب ویل کے قریب وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ پھر ان میں سے ایک نے روٹی اور لسی وہیں رکھی اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی۔ میں ان کے قریب تھا یا پھر میری آنکھوں کی چمک بہت زیادہ بڑھ گئی تھی کہ مجھے ان کی ایک ایک حرکت بخوبی دکھائی دے رہی تھی۔

بغیر آہٹ پیدا کیے میں کچھ اور آگے سرک آیا۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی آپس میں ہونے والی بات چیت سے کچھ اندازہ حالات کا لگا لوں۔

''کمال ہے ہردیپ کہاں چلا گیا۔''

ایک نے اپنی دوسری ساتھی سے کہا۔

''موگے پر گیا ہوگا آج ہماری باری بھی تو ہے۔''

دوسری نے اپنا خیال پیش کیا۔

لیکن اس موگے کے لفظ سے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ نہر یہاں سے نزدیک ہی ہوگی یا پھر نزدیکی نہر سے نالے کے ذریعے یہاں پانی پہنچایا جارہا ہوگا کیونکہ زمینداروں کو جو پانی سرکاری طور پر مہیا کیا جاتا ہے وہ جس سوراخ سے گزر کر آتا ہے اس کی حفاظت کے لیے عموماً زمیندار کا کوئی آدمی وہاں اس وقت تک موجود رہتا ہے جب تک ان کا پانی لینے کا وقت ختم نہ ہو جائے۔ بصورت دیگر اس بات کا خطرہ موجود رہتا ہے کہ ان کے پانی کا رخ کوئی اپنے کھیتوں کی طرف نہ موڑ لے۔

ہمارے مقامی ایجنٹ نے سرحد کے نزدیک کسی نہر کی نشاندہی بھی کی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں زیادہ دور بھٹک کر نہیں نکل گیا اور اب بھی مختلف نشانیوں کی مدد سے سرحد عبور کرسکتا ہوں۔

''لیکن اس وقت تو آجانا چاہیے تھا۔''

پہلی نے تشویش ظاہر کی۔

''اے بہن! جب سے سرپنچ کو منظوری ملی ہے اس نے آفت مچا رکھی ہے اب تو جس کی باری ہو اسے ''نکے'' پر ہی ٹھہرنا پڑتا ہے۔ ورنہ راستے سے ہی سرپنچ کے آدمی پانی کاٹ لیتے ہیں۔ ہوگا کہاں ہرویپ سیہاں! وہیں کھڑا ہوگا پانی کے سر پر، چل تو روٹی یہاں رکھ دے ہم آگے کشوری کو روٹی دے آئیں۔ واپسی پر وہ موجود ہوگا۔ اگر پہلے آگیا تو روٹی کھالے گا اسے تو علم ہے کہ تو روٹی لے کر آگئی ہوگی۔''

اس کی دوسری ساتھی نے تجویز پیش کی غالباً وہ جس کے لیے روٹی لے کر آتی تھی اس کا کھیت یہاں سے دور تھا۔

ہرویپ کی روٹی لانے والی عورت نے روٹی قریب کمرے کے دروازے پر کنڈی کھول کر اندر رکھ دی۔ پھر نشانی کے طور پر دستر خوان باہر کنڈی میں ہی پھنسا گئی۔ اس طرح یہاں آنے والے کو علم ہو جاتا کہ اندر اس کی روٹی دھری ہے۔

جیسے ہی وہ دونوں وہاں سے چلیں۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔

یہ بات تو ظاہر تھی کہ اگر ہرویپ نزدیک ہی کہیں موجود ہوتا تو وہ اسے آواز دے کر بلا لیتی یا ان میں سے ایک یہیں کھڑی رہتی اور دوسری اسے بلا کر لے آتی..... شاید ''موگا'' جس سے اس کے کھیتوں کو پانی آرہا تھا یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ ابھی ہرویپ کے آنے میں کچھ وقت لگے گا۔

جو عورت یہاں روٹی رکھ کر اپنی ہمراہی کے ہمراہ آگے ''کشوری'' کے پاس گئی تھی اس کی حالت دوسری سے قدرے بہتر دکھائی دیتی تھی یوں بھی دور دور تک شاید انہی کی زمین پر ٹیوب ویل لگا نظر آرہا تھا۔

میں جس ہرویپ کے کھیتوں میں چھپا ہوا تھا اس کا شمار واقعی اس علاقے کے متمول زمینداروں میں ہوتا تھا۔ سرحد پار کرنے کے بعد میری اس بات کی تصدیق بھی بعد میں ہوگئی تھی۔ یہاں زیادہ تر زمینداروں کی کاشتکاری کا دارومدار حکومتی پانی یا پھر باران رحمت پر تھا۔ کسی کسی نے ہی ٹیوب ویل لگایا ہوا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر یہاں سے نکلوں اور اطمینان سے روٹی کھالوں۔ شام کو روانگی کے وقت ہم نے احتیاطاً کھانا کھایا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ رات کو سرحدوں کے آر پار آنے جانے والے اپنے کام سے لوٹنے کے بعد کھانا کھاتے ہیں تاکہ سفر میں نیند انہیں نہ ستانے لگے۔

اب حالت یہ تھی کہ محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً میرے پیٹ میں چوہے ناچ رہے تھے۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ میں باہر نکلوں اور کوئی وہاں نہیں آئے گا؟

.....☆☆☆.....

میں عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ باہر نکلنے کا ارادہ کرتا اور توڑ دیتا بالآخر بھوک میری سوچ پر غالب آئی اور میں بلی کی طرح دبے پاؤں آواز پیدا کیے بغیر باہر نکل آیا۔ باہر آکر میں نے اس سمت آنے والے تمام ممکنہ راستوں پر نظریں دوڑائیں لیکن دور دور تک کسی ذی ہوش کا نام ونشان دکھائی نہ دیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں کمرے کے اندر تھا میں نے روٹی یہاں سے غائب کرنے کے لیے ایک پلان اپنے ذہن میں مرتب کرنے کے بعد ہی اس کوٹھڑی نما کمرے کی کنڈی کھولنے کی جرأت کی تھی۔ اندر ایک چارپائی پر ایک بڑے رومال میں کافی تعداد میں گھی سے چپڑی ہوئی روٹیاں، اچار اور لسی کے ساتھ موجود تھیں۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے میری بھوک اور بڑھائی۔ وہ کم از کم ایک آدمی کا کھانا تو نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے بڑی بے صبری سے رومال کی تہیں کھول دیں۔ رومال کو گانٹھ نہیں لگائی گئی تھی۔

وہاں سے چار روٹیاں اٹھائیں اور باقی روٹیاں چارپائی پر بکھیر دیں۔ اب میں نے اوپر والی دو تین روٹیاں اس طرح کاٹیں کہ وہ کسی جانور کا کارنامہ معلوم ہو۔ بظاہر میں نے بالکل ایسا انداز اپنایا تھا کہ یہ کسی بلی کا کارنامہ معلوم ہوا۔

کچی اینٹوں کے اس کمرے میں ہوا کے لیے دیواروں میں کھلے سوراخ رکھے تھے۔ ان کے آگے کوئی جالی یا سلاخیں نہیں لگی تھیں ظاہر ہے اس راستے سے کوئی بھی جانور آسکتا تھا۔ جب کام ٹھیک طریق سے انجام پا گیا تو میں نے برتن کو منہ لگا کر جی بھر کے لسی پی۔

گاؤں کی تازہ لسی نے حلق سے نیچے اترتے ہی آب حیات کا کام کیا تھا میرے جسم کی رگیں جو خوف، پیاس اور بھوک کے مارے خشک ہو رہی تھیں یوں لگا جیسے ان میں تر و تازہ خون دوڑنے لگا ہو۔

باقی لسی برتن سمیت میں نے اس طرح چارپائی پر گرائی جیسے یہ بھی اسی جانور کا کارنامہ ہو جس نے روٹیاں خراب کی تھیں۔ ایک مٹی کے لوٹے میں وہاں رکھے گھڑے سے پانی بھرا اور کھیتوں کے اس وسیع سلسلے میں اندر ہی اندر بھاگتا چلا گیا۔

دروازہ میں نے واپسی پر اسی طرح بند کر کے باہر دسترخوان بھی لٹکا دیا تھا۔

وحشیوں کی طرح میں نے چاروں روٹیاں کھائیں۔ جی بھر کے پانی پیا۔ اب میں قدرے نارمل ہو چکا تھا۔ جب پیٹ کا جہنم ٹھنڈا پڑا تو دماغ سوچنے کے قابل ہوا اور مجھے ان دونوں کی گفتگو یاد آنے لگی۔ وہ اس نہر کے قریب ہونے کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ جس سے تھوڑے

ہی فاصلے پر میرے ملک کی سرحد واقع تھی۔

یہ نہر انڈیا کے علاقے میں تھی اور عموماً سمگلروں کو پکڑنے کے لیے ناکے اسی پر لگائے جاتے تھے۔

میری اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ ایسی کیفیت جس کا اظہار الفاظ میں کم از کم ممکن نہیں مجھے سرحد کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی اس سے پہلے میں نے کبھی سرحد پار کی تھی۔ لیکن مختلف سمگلروں سے باتیں سن سن کر مجھے تمام حالات سے آگاہی ضرور تھی۔

یہ لوگ جب کبھی آپس میں اکٹھے ہوتے تو نشے کی سرنگ میں اپنے واقعات ایک دوسرے کو سنانے لگتے تھے۔ میں اگر کسی ایسی محفل میں موجود ہوتا تو نجانے کیوں بڑی دلچسپی سے ان کی گفتگو سنتا رہتا تھا شاید میری چھٹی حس نے یہ واقعات آنے والے دور کے پیش نظر میرے لاشعور میں محفوظ کر رکھے تھے..... یا پھر قدرت کو یہی منظور تھا۔

میں نے خود بھی سوچا نہیں تھا کہ میں اس طرح بین الاقوامی سرحد عبور کیا کروں گا یہ منزل تو بہت بعد میں آیا کرتی تھی اس روز بھی مسز نادرہ نے مجھے باول نخواستہ ہی اس مشن پر روانہ کیا تھا۔

شاید عام حالات میں وہ کبھی مجھے خطرات کے اس اندھے کنویں میں نہ دھکیلتی۔ میں نے رات کم از کم پانچ چھ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ میں صرف دو میل تک بھارتی سرحد کے اندر آیا تھا اندھیرے میں سمت کا اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے میں چاروں طرف زیادہ تر گھومتا ہی رہا تھا۔

شاید سیدھا نہیں چل پایا تھا۔ کیونکہ میرے جیسے اناڑی کے لیے تو رات کو آسمان پر چمکنے والے مختلف ستاروں کا راستے کی راہنمائی کے لیے استعمال جانے بغیر سیدھا چلنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ سرحد کو پار کیا جائے تو کس وقت اور کس طرح؟

.....☆☆☆.....

رات کے وقت تو میں اسی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا اور نہ جانے

کہاں سے کہاں نکل جاتا۔اس لیے رات کو سرحد عبور کرنے کے امکانات پر تو میں نے سوچنا بھی فی الوقت بے وقوفی جانا پھر میرے ذہن نے رہنمائی کی کہ کسی طرح میں دن کی روشنی میں نہر کے قریب پہنچ جاؤں۔تو وہاں سے کم از کم اپنی سمت درست رکھ سکوں گا اور شام ڈھلتے ہی جب ہلکی ہلکی روشنی بھی ہوگی تو سرحد عبور کر لی جائے۔اس طرح میں کم از کم بھارتی علاقے میں گرفتار نہیں ہوسکتا تھا۔

پاکستان کی بات البتہ اور تھی۔وہاں میرے بچنے کی بھی کافی امید تھی۔لیکن نہر تھی کس سمت؟

اب مسئلہ یہ آن کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنے اسکول کے زمانے میں پڑھا ہوا جغرافیہ یاد آ گیا۔بھارت ہمارے مشرق میں واقع ہے اور ہم اس کے مغرب میں سورج کی مخالف سمت۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ بھارت اور پاکستان سورج کی مخالف سمت میں ہوں گے۔

یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کا خطرہ تو میں اب مول لینے سے رہا۔یوں بھی پیٹ کا دوزخ ٹھنڈا ہونے کے بعد سے مجھے اپنی گمشدہ توانائیاں واپس لوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے کھڑے ہو کر احتیاط سے چاروں اطراف کا جائزہ لیا فی الحال تو دور دور کسی آدم زاد کا نام ونشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔خدا کو یاد کرتا میں باہر نکل آیا۔

میں نے لباس تو دیہاتیوں والا پہن رکھا تھا۔اپنی بقیہ چادر کو مقامی لوگوں کی طرح سر پر باندھ لیا دھوتی کو لنگوٹ کی شکل دے لی۔مقامی لوگ عموماً اس طرح دھوتی باندھا کرتے تھے۔ ہر طرف کھیتوں کا وسیع سلسلہ تھا اور میں۔نجانے کم بختوں نے ایسے ریتلے اور غیر آباد علاقے میں اتنی ہریالی کیسے پیدا کر لی تھی۔کیونکہ ہماری سمت تو زیادہ تر ریتلے ٹیلے ہی ملا کرتے تھے یا پھر کانٹے دار خودرو جھاڑیاں۔میں نے کھیتوں کے درمیان بنا ہوا راستہ اپنایا تھا اور سورج کو اپنی پشت پر رکھ کر سفر کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اپنی پوزیشن ٹھیک کر لیتا۔اب مجھے دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مقامی کسان بھی دکھائی دینے لگے۔

دل ہی دل میں، میں اس وقت خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے آواز نہ دیں، یا

میرے متعلق سوچنا نہ شروع کر دیں اور خدا نے خاصی مہربانی فرمائی وہ لوگ کھیتوں میں اپنے کام میں اتنے معروف تھے کہ کسی کو شاید میری طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں میسر تھی۔

.....☆☆☆.....

ایک آواز دور سے میرے کان میں پڑی۔غالباً کسی نے ہریش کہہ کر پکارا تھا۔ایک لمحے کے لیے تو میں گڑبڑا کر ہی رہ گیا۔میرے خدایا! میں نے سوچا اب کیا کروں۔اگر بھاگنا شروع کر دیا تو وہ لوگ مجھے مشتبہ جانیں گے اور دن کے اجالے میں مجھے گھیر کر مار ڈالیں گے۔ کیونکہ یہاں سے دن کے اجالے میں فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔شاید کسی نادیدہ قوت نے اس لمحے راہنمائی کی تھی میرا وہ عمل قطعی لاشعوری تھا جب میں نے آواز دینے والے کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ لہرا دیا۔

.....☆☆☆.....

کھڑی فصلوں کے درمیان سفر طے کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔فصلوں کے درمیان اگے ببول میری ننگی ٹانگوں پر خراشیں لگا رہے تھے۔دھوتی جسے میں نے لنگوٹ کی طرح باندھ رکھا تھا اسے لنگانا مناسب نہیں تھا۔اس طرح دھوتی کانٹوں وغیرہ میں الجھ بھی سکتی تھی۔

جان بچانے کا جذبہ کتنا طاقت ور ہوتا ہے۔

اس کا احساس مجھے اس روز اچھی طرح ہوا حالانکہ اس سے پہلے بھی میں دو تین مرتبہ موت کے منہ سے بال بال بچا تھا لیکن شاید وہ اپنا وطن تھا اور مجھے میڈم نادرہ جیسی بااثر عورت کی ملکی پشت پناہی حاصل تھی یہی وجہ تھی کہ میرے محسوسات آج جیسے بالکل نہیں تھے۔یہاں میں بالکل بے یار و مددگار اور اکیلا تھا۔

پرایا دیس دشمن ملک۔میں پڑھا لکھا نوجوان تھا۔جانتا تھا کہ ہندو کی سرزمین پر بھٹک رہا ہوں اگر ان کے قابو آ گیا تو یہ لوگ پہلے فوراً جاسوس سمجھ کر پکڑ لیں گے اور میرے صفائی دینے تک میرا ہی صفایا کر ڈالیں گے۔

مجھے جلد از جلد اس جہنم زار سے نکلنا تھا مجھے بہر صورت اپنے وطن اپنی ماں کے پاس

پہنچنا تھا۔

میرا زندہ رہنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ مجھ سے اور زندگیاں بھی وابستہ تھیں۔

یہ تھا وہ عزم جس نے لاکھ نامساعد حالات کے باوجود پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی۔

دو میل کا یہ فاصلہ دو صدیوں پر محیط ہوتا دکھائی دیتا تھا بالآخر ختم ہوا۔

اب مجھے بڑی نہر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اس درمیان میں نے وہ "راجباہ" (پانی کے نالے) بھی عبور کر لیے تھے پھر وہ مبارک ساعت بھی آن پہنچی جب میں نے قریباً تیس گز دور پٹڑی کو بھی دیکھ لیا تھا..... میں وہیں رک گیا۔

یہاں قریب ہی ایک اور کھیت نظر آ رہا تھا جس کھیت میں میں چھپا بیٹھا تھا اس کے اور سامنے نظر آنے والے کھیت کے درمیان قطعہ اراضی خالی پڑی تھی سامنے نظر آنے والے کھیت سے پھر نہر کا فاصلہ بمشکل پندرہ بیس گز ہی رہ جاتا تھا اور وہ جگہ نہر کنارے بنے راستے نے گھیر رکھی تھی۔

یہ راستہ پکی اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور شاید فوج اور بارڈر سکیورٹی فورس ہی کے استعمال میں رہا کرتا تھا۔

میں نے اگلے کھیت تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا لیکن اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ یہاں کوئی خفیہ پوسٹ ہی موجود نہ ہو ایسی پوسٹیں سرحدی نگہبانی کے فرائض دینے کے لیے قائم کی جاتی ہیں..... اس خدشے کے پیش نظر میں نے بہت احتیاط سے چاروں اطراف نظریں دوڑا کر اس بات کا اطمینان کر لیا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا اور نہ ہی یہاں دور دور تک کسی سرحدی چوکی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

میں اللہ کا نام لے کر اس کھیت سے نکلا اور مختصر قطعہ اراضی کو تیز قدموں سے پھلانگ کر اگلے کھیت میں جا پہنچا۔

یہاں سے نہر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نہر کے پار حد نگاہ تک ریت اور جھاڑیاں ہی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں کچھ سرکنڈوں کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دور جہاں آسمان اور زمین آپس میں گلے ملتے دکھائی دے رہے تھے وہاں کچھ درخت نظر آ رہے تھے جو اس

بات کی علامت تھی کہ یہ پاکستانی علاقہ کا کوئی گاؤں ہے۔ میں شام تقریباً 5 بجے تک وہیں رکا رہا۔

اس اثناء میں وہاں سے دو مرتبہ سرحدی پہرے داروں کا گزر ہوا۔ یہ لوگ تھے جو پہرہ بدلنے پر اپنی اپنی چوکیوں کی سمت جا رہے تھے۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہاں ان کے بالکل نزدیک کوئی دن کے اجالے میں چھپا بیٹھا ہے۔ فصلیں چونکہ پکنے پر آ رہی تھیں لہٰذا کسان بھی کھیتوں میں کم ہی نظر آتے تھے۔

.....☆☆☆.....

میرے سامنے تو میدان صاف دکھائی دے رہا تھا لیکن اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ جیسے ہی میں باہر نکلوں گا کسی سرحدی چوکی میں واقع "سرچنگ ٹاور" پر کھڑے سپاہی کی طاقتور دوربین کی زد میں نہ آ جاؤں؟ اور پھر سیسے کی ایک گولی میرا مقدر بن کر رہ جاتی لیکن ان تمام خطرات کے باوجود مجھے سرحد عبور کرنا اور اپنے ملک میں جانا تھا جہاں ایک بوڑھی ماں اپنے جوان بیٹے کی بلائیں لینے کی منتظر تھی۔

کھیت سے نہر تک کا قریباً بیس گز کا علاقہ بالکل صاف تھا شاید انڈیا کی سرحد میں واقع یہ آخری کھیت تھا کیونکہ نہر کی دوسری سمت کوئی ہریالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس طرف کا علاقہ پاکستانی سرحد کے نزدیک ہونے کی وجہ سے دفاعی تقاضوں کے پیش نظر بھارتی فوج نے جوں کا توں چھوڑ رکھا تھا کیونکہ لڑائی کی صورت میں نہر کے اس کنارے تک فوراً پاکستانی فوج قابض ہو جاتی تھی۔

میں آہستہ آہستہ باہر نکلا اور تجربہ کار فوجیوں کی طرح رینگتا ہوا نہر کی سمت بڑھنے لگا سورج اب پاکستانی سرحد میں غروب ہو رہا تھا اس نے اپنے سفر کا اختتام اور میں نے آغاز کیا تھا۔

نہر کے کنارے پہنچ کر میں نے دونوں اطراف دور دور تک نظر دوڑائی میدان صاف تھا اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا نہر میں نظر ڈالی تو اپنے ارمانوں پر اوس پڑتی دکھائی دینے لگی کیونکہ نہر خاصی گہری تھی اور اس کے دونوں کنارے پختہ اور کافی اونچے تھے یعنی دوسری سمت پہنچنا سوائے اس صورت کے کہ سہارا دینے کے لیے کوئی رسی یا دوسری طرف کوئی شخص موجود

ہونا ممکن تھا۔

نہر کے کنارے جان بوجھ کر پانی سے کم از کم چھ سات فٹ اونچے رکھے گئے تھے چونکہ یہ نہر وفائی تقاضوں کے پیش نظر تیار کی گئی تھی اور اس میں مصلحت یہی کارفرما تھی کہ ایک مرتبہ نہر میں اترنے والا پھر باہر آسانی سے نہ نکل پائے جو مقامات اس مقصد کے لیے بنے ہوئے تھے اور جہاں سے کنارہ نیچا تھا وہاں یہ لوگ ''ناکہ'' لگا کر بیٹھ جایا کرتے تھے تاکہ یہاں سے برآمد ہونے والے کا خاطر خواہ استقبال کر سکیں۔

''میرے خدا'' میں نے سوچا ''کیا میں کبھی نہر کے اس پار نہیں جا پاؤں گا۔''

میرا دل بیٹھنے لگا تھا ساری محنت اور دعائیں رائیگاں جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ شاید تجدید عہد کا لمحہ تھا۔

شاید قدرت ایک مرتبہ پھر مجھ سے وعدہ لینا چاہتی تھی۔ اپنی اگلی زندگی کو انسانوں کی طرح بسر کرنے کا وعدہ۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے عہد کی تکرار کی ایک مرتبہ پھر میری آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہوئیں ایک مرتبہ پھر میرا کلیجہ کٹا۔

اس لمحے میری حالت اس خوفزدہ بچے جیسی تھی جو بردہ فروشوں کے چنگل میں گھر چکا ہو۔ میں بھیڑیوں کے غول میں پھنسی بھیڑ تھا کسی بھی لمحے کوئی بھی شعلہ برساتی زبان والا بھیڑیا مجھے ہڑپ کر سکتا تھا۔ کسی بھی سمت سے اچانک آنے والی گولی مجھے موت کی ذلت سے دوچار کر سکتی تھی۔

میری لاش بھی میری ماں کو دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ میں مرنے سے نہیں موت کے اس ذلیل ترین روپ سے خوفزدہ تھا۔

حشرات الارض نے چیخم دھاڑ شروع کر دی تھی اور رات اپنی پوری نحوست کے ساتھ میرے سر پر مسلط ہونے لگی تھی۔ مجھے سامنے کا راستہ حفظ ہو چکا تھا لیکن 10 فٹ چوڑی یہ نہر میرے لیے پل صراط بن گئی تھی۔

عین ان لمحات میں جب میں دم توڑتے مریض کی طرح بے دم ہو رہا تھا میرے وائیں

طرف کچھ فاصلے پر کچھ جنگلی جھاڑیاں دست مسیحا بن کر نمودار ہوئیں۔

دم توڑتے اجالے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں نے اس سمت دیکھا نہر کے دوسرے کنارے پر اگی خودرو جھاڑیوں کا ایک گچھا پانی کی سمت نیچے لٹک رہا تھا اور میں کوشش کر کے اسے تھام سکتا تھا پھر اسی جنگلی گھاس کے سہارے نہر کے دوسرے کنارے پر بھی پہنچ سکتا تھا۔

یہ تائید غیبی تھی.....!

مجھے بچپن میں پڑھی وہ بہت سی کہانیاں یاد آ گئیں جب جن کی قید میں آنے والے شہزادے کو رحم دل پری یا بہادر شہزادی اچانک اچک کر لے جایا کرتی تھی۔

یہ کانٹے دار جھاڑیاں میرے لیے رحمدل پری کی طرح اچانک آسمان سے زمین پر اتر آئی تھیں۔ یہ میری ماں کی دعائیں تھیں۔ یہ وہ جھاڑ پھونک تھی جو ہر روز میرے والد سے پٹنے کے بعد اپنے دکھتے وجود کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد میری ماں مجھ پر کیا کرتی تھی۔

وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں سو رہا ہوں لیکن میں جاگ رہا ہوتا تھا۔ تب مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ آیا کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ اتنی بے بس نہ بنے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ایسی کئی پھونکیں وہ اپنے ہاتھوں پر مار کر اپنے ہاتھ بھی تو دن میں کئی مرتبہ اپنے چہرے پر پھیرتی ہے۔

اگر ان پھونکوں سے وحشت اور درندگی کے دیئے بجھائے جا سکتے تو میری ماں کو رات کے اندھیروں میں ہم سے چوری چوری اپنے بدن کی چوٹیں نہ سہلانا پڑتیں۔

لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ دراصل انسان کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ کچھ دعائیں تو فوراً ''ڈیبٹ کریڈٹ'' ہو جاتی ہیں اور کچھ ریزرو اکاؤنٹس میں قدرت کی طرف سے جمع کر دی جاتی ہیں تاکہ دعا کنندہ کو اس کی توقع سے بڑھ کر منافع کے ساتھ نوازا جائے۔

شاید رات کے دوسرے پہر تہجد کے لمحات میں میری ماں نے بھی میرے لیے کوئی ایسی ہی دعا مانگی تھی جسے قدرت نے اس برے وقت کے لیے میرے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کر دیا تھا اور آج یہ دعائیں حیات نو بن کر میری طرف لوٹی تھیں۔

انسان کتابوں سے بھی علم حاصل کرتا ہے اور تجربے سے بھی۔ لیکن تجربے سے حاصل

کردہ علم کی بنیاد کتنی مضبوط کتنی گہری ہوتی ہے اس کا ادراک مجھے بخوبی ہو چکا ہے۔

جھاڑیوں کا وہ کانٹے دار بودا جو ریتلی زمین کی کوکھ سے سر نکال کر دس فٹ چوڑی اس نہر کے پکے کنارے کی طرف پانی میں جھک آیا تھا دراصل وہ طلسماتی ہاتھ تھا جس نے خوفناک جنوں میں گھرے معصوم شہزادے کو جنوں کے عین درمیان سے اٹھا کر اسے آسمان کی بلندیوں پر سیر کرواتے ہوئے ملکہ کے محل میں پہنچا دیا تھا۔

شاید زندگی بھر کے مطالعے کے بعد بھی میں نیکی اور بدی کے اس فلسفے کو نہ سمجھ پاتا جو اس ایک لمحے نے مجھے عطا کر دیا۔

میں ساون کے اندھے کی طرح مسز نادرہ کی دنیا ہی کو ساری دنیا سمجھ رہا تھا۔ میں نے یہی جانا تھا کہ بس اب مجھے دنیا کی ہر نعمت میسر آ گئی ہے۔ میں نے حرام کی اس کمائی کو ہی حیات کا حاصل جان لیا تھا۔ اس کو زندگی کے سارے مسائل کا شافی علاج تصور کر لیا تھا۔

لیکن آج اس سب کچھ کی حیثیت پانی کی سطح پر نمودار ہونے والے بلبلے جتنی بھی نہیں رہ گئی تھی۔

مجھے اس حقیقت ساز گھڑی نے ماں کی عظمت اور سچے دل سے نکلی دعا کی حقیقت کا قائل کر دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں جانے کتنی مرتبہ اس مبارک ساعت پر سلامتی بھیجی جس نے میری آنکھوں کو سچائی کے نور سے آشنا کر دیا تھا۔ میرے حوصلہ دو چند ہو گئے تھے۔

اک عزم تازہ اک ولولہ نو، کے ساتھ میں نے بڑی مضبوطی سے اپنے قدم نہر کے کنارے کی طرف بڑھانے شروع کیے تھے میرا ایمان تھا اگر اس طرف کسی ''دیدبان'' کی نظریں بھی لگی ہوئی ہیں تو وہ اب تک اندھا ہو چکا ہو گا اور اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔

.....☆☆☆.....

میں نے اپنے جوتے پہلے ہی چادر میں تہہ کر کے سر پر رکھ لیے تھے۔ نہر کنارے پہنچ کر میں نے بڑے اطمینان سے نہر کنارے پر بیٹھ کر اپنے پاؤں پانی میں لٹکا دیئے۔ پورے پاؤں نیچے لٹکانے کے باوجود ابھی تک میرے پاؤں کو پانی نہیں چھوا تھا۔ پھر میں نے اپنے ہاتھوں کو

کنارے پر جمایا اور نہر میں لٹک گیا۔

اب بھی میرے پاؤں ہی بمشکل پانی میں ڈوبے تھے۔ نہر کی پکی دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکائے ہوئے میں ہلکی سی آواز پیدا کرنے کے بعد پانی میں اتر گیا۔ بچپن سے تیراکی کا شوق آج میرے کام آیا تھا۔ پہلے اپنے سر پر دھرے جوتے آہستہ سے کنارے پر پھینک دیئے پھر ذرا سی ٹیک لگا کر اپنے سر پر بندھی چادر کو کھولا اور دونوں ہاتھوں کے گرد لپیٹ لیا یہ عمل میں نے اس خدشے کے پیش نظر دہرایا تھا کہ اس طرح میں جھاڑیوں سے منسلک نوکیلے کانٹوں سے کسی حد تک محفوظ رہ سکوں گا۔

میرے سر کے بالکل اوپر محض دو یا تین فٹ کے فاصلے پر جنگلی جھاڑیاں لٹک رہی تھیں۔ میں نے خدا کو یاد کر کے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے جسم کی ساری قوت ٹانگوں میں جمع کر کے اوپر کی طرف اچھلا پہلی کوشش میں تو میں منہ کے بل نیچے آن گرا، اور پانی میں گرنے سے شڑاپ کی جو زوردار آواز پیدا ہوئی اس نے تو جیسے میری جان ہی نکال دی۔

دونوں ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے مجھے ایک غوطہ بھی آ گیا لیکن اوسان بحال رہے پانی میں گرنے سے پیدا ہونے والی آواز نے جو خوف مجھ پر طاری کیا تھا وہ کیفیت چند لمحوں کے بعد ختم ہو گئی مجھے اس بات کی جیسے بالکل پرواہ ہی نہیں رہی تھی کہ یہ آواز کہاں تک گئی ہے۔

اور اس کا ردعمل کیا ہو گا؟

.....☆☆☆.....

دوبارہ میں نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا میری ماں کا پر شفقت ہاتھ مجھے اپنے سر پر سایہ فگن محسوس ہو رہا تھا اور اب مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ میں نے دوبارہ اپنی تمام قوتیں ٹانگوں میں جمع کیں اور پانی ہی میں پاؤں سمیٹ کر دوبارہ وہی عمل دہرایا۔

اس مرتبہ جھاڑی میرے ہاتھوں میں آ ہی گئی۔ ہاتھوں پر چادر بندھی ہونے کے باوجود لمبے لمبے کانٹے میری ہتھیلیوں میں گھس رہے تھے لیکن درد کا احساس تو جیسے کبھی کا دم توڑ چکا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں نہر کی دیوار سے ٹکا دیئے دوبارہ اپنے جسم کو تول کر زور لگایا ایک ہی جھٹکے میں،

میں نہر سے باہر تھا۔ ہاتھوں پر بندھی ہوئی پٹیوں کا رنگ میری ہتھیلیوں سے بہتے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

باہر گرنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی میں جھاڑی کے ساتھ ہی دم سادھ کر لیٹ رہا۔ دوسری طرف کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی اندھیرے میں ٹٹول کر میں نے اپنے جوتے پہنے اور چند سیکنڈ کے اندر ہی ہتھیلیوں میں رہ جانے والے کانٹے نکال باہر کیے اور دونوں ہاتھوں پر دوبارہ وہی گیلی چادر پٹیوں کی طرح باندھ لی جلن اور اذیت تو کافی تھی لیکن گیلی پٹیوں نے قدرے سکون بہم پہنچا دیا تھا۔

مطمئن ہو کر میں نے پھر رخت سفر باندھا۔ میں جھک جھک کر تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح چل رہا تھا۔

زیادہ تر جھاڑیوں کی اوٹ ہی میں رہتا۔ اب اندھیرا اچھا خاصا چھا چکا تھا اور دس بارہ گز کے آگے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا اپنے قائم شدہ اندازے کے مطابق میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا رہا راستے میں کہیں بھی میرا انکراؤ سرحدی محافظوں سے نہیں ہوا وس فٹ چوڑی نہر کا پل صراط طے کرنے کے بعد سے جیسے کسی نادیدہ طاقت نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ اب پاکستان پہنچنے سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی۔

اندھیرے میں اچانک چلتے چلتے سفید رنگ کا ایک ہیولا دیکھ کر میں یکدم چونکا اور کسی برقی عمل کے زیر تابع وہیں زمین پر کہنیوں کے بل لیٹ گیا۔

یہ سفید ہیولا اچانک ہی اندھیرے کی چادر میں سے نمودار ہوا تھا۔ میں دو تین منٹ تک دم سادھے لیٹا رہا جب اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تو اپنی بزدلی پر غصہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا یہ وہ سرحدی برجی تھی جو نشاندہی کے لیے نصب کی جاتی ہے۔

پاکستانی علاقے میں پہنچنے کا احساس مجھے کسی "ہیر" گانے والے کی آواز سے ہوا۔ عموماً ہمارے دیہاتوں میں رات کے وقت لوگ کسی جگہ اکٹھے بیٹھ کر "لوک داستانیں" سنتے ہیں اور رات دیر گئے تک یہ عمل جاری رہتا ہے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ یہ سنگروں کا بھی

ایک مخصوص سگنل ہے اس طرح وہ دوسری سمت سے آنے والوں کی رہنمائی بھی کر دیتے ہیں کہ اب وہ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں۔

.....☆☆☆.....

اپنی سرزمین پر پہنچ جانے کے احساس نے مجھے ایک مرتبہ پھر رلا دیا۔ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے میری آنکھیں خداوند تعالیٰ کے حضور نذرانہ عجز و انکسار پیش کر رہی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس طرح واپس لوٹ آؤں گا۔

اس روز مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ میں تو بہت بزدل انسان ہوں۔ اتنا بزدل کہ معمولی خوشی بھی برداشت نہ کر سکا اور بچوں کی طرح رو دیا۔

ماں اور زمین کی مشترکہ محبت نے آنسوؤں کی شکل میں میری آنکھوں سے اپنے لیے خراج وصول کر لیا تھا۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ میں نے سرحد اس مقام کے نزدیک سے پار کی ہے جہاں سے میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑا تھا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ نہر جو بھارتی سرزمین پر بہتی ہے۔ یہ سیدھی نہیں بل کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ کہیں اس کا فاصلہ سرحد سے آٹھ دس میل اور کہیں محض تین چار فرلانگ رہ جاتا ہے۔ اس لیے جب میں فائرنگ سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا تو میرے راستے میں نہر نہیں آئی تھی جب کہ واپسی پر میں نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا نزدیک کسی گاؤں کے آثار دکھائی دے رہے تھے لیکن ابھی میں کسی گاؤں میں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

میرے لیے اگر پناہ تھی تو اسی گاؤں میں جہاں سے ہم نے اس جان لیوا سفر کا آغاز کیا تھا میں ایک لمبا چکر کاٹ کر گاؤں سے آگے نکل گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مسلسل دوڑ نے اب مجھے تھکا دیا تھا ستمبر کی رات کے آخری پہر کو اس سرحدی علاقے میں چلنے والی ہوا نے مجھ پر مدہوشی سی طاری کر دی تھی۔

میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ میں نے صبح وہی دو چار روٹیاں جنہیں روٹی کہنا بھی زیادتی ہو گی کیونکہ وہ ہندو کے دل کی طرح چھوٹے چھوٹے پھلکے تھے کھائی تھیں اس

درمیان میں نے نہ صرف بے تحاشا جسمانی مشقت کی تھی بلکہ اپنے آپ سے ایک اعصاب شکن لڑائی بھی لڑی تھی۔

اوس سے میرے کپڑے اور پاؤں بھیگنے لگے تھے۔ جوتی کے تلوں پر جمی ریت اور مٹی نے میرے قدم خاصے بوجھل کر دیئے تھے بھوک سے زیادہ نیند کا احساس ستا رہا تھا۔

مجھ پر غنودگی حملہ آور ہو رہی تھی۔ دل یہی چاہتا تھا کہ کہیں بھی کسی بھی جگہ لمبی تان کر سو جاؤں لیکن میں ابھی سو نہیں سکتا تھا مجھے ابھی یہ جنگ جاری رکھنی تھی۔

میں اپنی زندگی کی کتاب میں پولیس تھانے یا جیل کے باب کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود کہ دن چڑھنے سے پہلے میرے مالکان مجھے رہا کروا لیتے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے والد کی طرح میں بھی پولیس کی لسٹ پر آؤں۔

سرحد سے میں دور ہی دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ایک مرتبہ پھر میری آنکھوں نے دور جہاں زمین آسمان باہم دست و گریبان دکھائی دے رہے تھے وہاں سے نور کی سرخ کرنوں کو پھوٹتے دیکھا۔ ایسا خوبصورت اور جاں بخش نظارہ میں نے اس سے پہلے کب دیکھا تھا۔ آنکھوں میں ایک تراوٹ سی اترتی چلی جا رہی تھی۔

زرد اور سرخ رنگ کی روشنیوں کے ملاپ سے ابھرنے والی شفق نے اپنا دامن پھیلانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے جی بھر کر اس منظر سے خط اٹھایا فضا میں پھیلی مقناطیسیت کو لمبے سانس کے ذریعے اپنے جسم میں منتقل کیا۔ عین ان لمحات میں نزدیکی گاؤں کے لاؤڈ سپیکر نے انگڑائی لی اور کسی بوڑھے مؤذن کی مقدس آواز میں اذان بلند ہونا شروع ہو گئی۔

اس ماحول میں پہلی مرتبہ اذان کی آواز نے مجھ پر ایک وجد کا عالم طاری کر دیا تھا۔

میں نے اذان کے خاتمے پر اپنے ہاتھ دعا کے لیے پھیلا دیئے اور وہیں ایک "راجباہ" سے وضو کر کے زمین پر نماز پڑھنے لگا۔ سجدے میں جاتے ہوئے جب میرا ماتھا گیلی زمین سے

ٹکرایا تو مجھے یوں لگا جیسے زمین کا سارا حسن میرے ماتھے پر ہالہ بن گیا ہو۔

ایک مرتبہ پھر میرے ہاتھوں کی خدا کے حضور پھیلی ہوئی ہتھیلیاں میرے آنسوؤں سے تر ہو گئیں، پٹیاں میں نے اتار کر پھینک دی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آج میرے پھیلے ہوئے ہاتھوں اور میرے خدا کے درمیان کوئی بھی چیز حائل ہو میں نے خدا سے ایک ہی دعا صدق دل سے کی تھی۔

اپنے عہد پر قائم رہنے کی دعا۔

نئی زندگی کے راستے پر حائل ہونے والی رکاوٹوں سے نمٹنے کا حوصلہ مانگنے کی دعا۔

صبر اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی دعا۔

اور سب سے بڑھ کر اپنے چھوٹے سے کنبے کی سلامتی اور خوشیوں کی دعا۔

.....☆☆☆.....

میں نے جان بوجھ کر وہ راستہ اپنایا تھا جس پر لوگوں کی آمد و رفت کم ہی ہوتی تھی۔ کسانوں کے دن کا آغاز اذان سے بھی پہلے ہو چکا تھا اور اب مجھے بیلوں کے گلے میں لٹکتی گھنٹیوں سے پھوٹتے گیت بھی سنائی دینے لگے تھے۔ پہلے تو ارادہ یہی کیا تھا کہ یہاں سے سیدھا اپنے شہر چلا جاؤں گا لیکن میری جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس سرحدی قصبے میں موجود انٹیلی جنس والوں کی نظروں سے آسانی سے بچ کر نکل سکتا۔

قصبے کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور میں فوراً ہی پہچان گیا کہ میں کہاں پہنچ گیا ہوں۔ اپنے مطلوبہ ٹھکانے سے آٹھ دس میل دور نکل آیا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ قصبے میں داخل ہو جاؤں یا یہیں سے دوسرا راستہ اختیار کر لوں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہاں سے تین چار میل کے فاصلے پر واقع اپنے ایک ''سیف ہاؤس'' پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔

ہمارا گروہ بڑے سائنٹفک انداز میں کام کرتا تھا۔ کسی بھی مشن پر روانگی کے وقت یہ لوگ اپنے کارندوں کو اس راستے میں آنے والے ایک آدھ محفوظ مقام کا ایڈریس ضرور بتا دیتے تھے تاکہ کسی بھی خطرے کی صورت میں وہاں پناہ لی جا سکے لیکن یہ اس صورت میں ممکن تھا جب ایسا ناگزیر ہو جائے عام حالات میں کسی کو ''سیف ہاؤس'' کی طرف جھانکنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

اس راستے پر میں برسوں مال لے جا چکا تھا اور اس کے نزدیک کے ایک ''سیف ہاؤس'' کی خبر تھی۔ آج پہلی مرتبہ میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے سرحدی قصبے کے بازار میں جانے کے بجائے دو تین میل لمبا چکر کاٹا اور دو تین دیہاتوں کے باہر بنے راستوں

پر سفر کرتا بالآخر گھوم کر اس قصبے کے آخری کونے میں الگ تھلگ بنے ایک مکان پر پہنچ گیا۔

دستک دینے پر ایک درمیانی عمر کی عورت دروازہ کھولنے آئی۔ اس کے چہرے اور چال ڈھال ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کا اصل روپ کیا ہے۔

''کیا بات ہے کس سے ملنا ہے؟''

اس نے میری جسمانی حالت کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا سمجھ تو اسے بھی آ گئی تھی کہ میں کون ہوں اور کس سے ملوں گا لیکن اس نے تشفی کرنا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔

میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر متعلقہ آدمی کا نام لے دیا۔ میرے منہ سے نام ادا ہوتے ہی دروازہ کھل گیا بوجھل قدموں سے میں اندر داخل ہوا اور پشت پر مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

کمرے میں جس صورت سے سامنا ہوا، اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے سب سے پہلے اسی وادی گناہ میں ملی تھی جس پر میں نے اپنی شرافت کا گہرا نقش چھوڑا تھا۔

''تم؟''

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آپ.....'' اس نے بھی حیرانگی سے کہا..... ''آپ یہاں؟ خدا کا شکر ہے آپ کے لیے میڈم بہت پریشان تھی۔''

اس نے کہا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہ جانا۔ مجھے تو اس بات کی بھی فکر نہیں تھی کہ میرے ساتھیوں کا کیا حال ہوا ہے میں نے اس سے کسی کے متعلق استفسار نہ کیا۔

''آپ کے تینوں ساتھی زندہ ہیں..... ایک دو روز میں وہ بھی رہا ہو جائیں گے.....''

اس نے اپنی دانست میں مجھے خوشخبری سنائی۔

میں پھر خاموش رہا.....

اس نے میری اس عادت پر اس لیے جھنجھلاہٹ یا حیرانی کا اظہار نہیں کیا کہ وہ مجھ سے پہلے بھی متعارف ہو چکی تھی اور یہ جانتی تھی کہ میں اپنی قماش کا ایک الگ تھلگ انسان ہوں۔

جرائم کی اس دنیا میں ضرور رہتا ہوں لیکن میرا کوئی ذہنی رابطہ اس دنیا سے استوار نہیں ہو سکا۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے اس سے گھر میں موجود باتھ روم کا راستہ دریافت کیا تو اس نے بڑی بددلی سے میری راہنمائی باتھ روم تک کی تھی۔

''شکریہ!.....'' کہہ کر میں باتھ روم میں جا گھسا۔ میں نے اس کو اپنے لیے ناشتہ تیار کرنے کو کہہ دیا تھا۔

پانی میرے جسم کے جس جس حصے پر گر رہا تھا وہاں سے خارج ہوتی آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی۔ گو کہ میرا بدن درد سے چور چور تھا اور میرے لیے اس حالت میں نہانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔

لیکن میں نے تازہ دم ہونا ضروری سمجھا۔ باہر آ کر میں نے گھر ہی میں موجود درد رفع کرنے والی گولیاں چائے کے ساتھ نگل لیں۔

ناشتہ میں نے واقعی مدیدے بچوں کی طرح کیا تھا۔ میری بھوک اچانک چمک اٹھی تھی۔ دوران ناشتہ اسے دو مرتبہ میرے لیے رسوئی میں جانا پڑا۔ جیسے ہی معدہ بھرا مجھے نیند نے آلیا۔

میں کل رات سے نیند سے لڑائی کرتا آ رہا تھا۔ اب میں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس لڑکی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے کوئی نہ جگائے۔ میں خود ہی جاگوں گا۔

دوپہر تک میں لمبی تان کر سوتا رہا.....!

.....☆☆☆.....

آنکھ مکان کے دوسرے کمرے میں دو تین لوگوں کے درمیان اونچی آواز سے ہونے والی گفتگو کی وجہ سے کھلی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوسرے کمرے میں کچھ لوگ آپس میں بحث کر رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا کہ فلاں سے رابطہ کیا جائے اور کوئی فلاں کا نام لے رہا تھا۔ کسی کام سے اس کمرے میں آنے والے ایک شخص نے جب مجھے بیدار ہوتے دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔

دوسرے ہی لمحے وہ لوگ باجماعت ہو کر میری خبر گیری کر رہے تھے وہ سب اس حادثے پر بے حد شرمندہ تھے کیونکہ میڈم نے انہیں سخت وارننگ دی تھی کہ اگر میرا بال بھی بیکا ہوا تو وہ انہیں معاف نہیں کرے گی۔ حالانکہ اس نے خود مجھے اس جہنم کا ایندھن بننے کے لیے روانہ کیا تھا۔

ان میں سے ہر ایک مجھ سے یہی درخواست کر رہا تھا کہ میڈم سے اسے معافی دلوا دوں..... میں نے ان کے ساتھ صرف ''ہوں، ہاں'' ہی میں گفتگو کی۔

وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ گزشتہ واقعات کا اثر میں نے ضرورت سے زیادہ ہی قبول کر لیا ہے۔ حالانکہ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو یہ لوگ یہاں سے جائیں اور میں یہاں سے نکلوں۔ میں اب زیادہ دیر تک ان لوگوں کا ساتھ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ میں مزید آرام کروں۔

''کوئی سیوا باؤ جی!''

ایک مقامی سمگلر نے مجھ سے دریافت کیا۔ یہ شخص یہاں تو بھیگی بلی بنا کھڑا تھا لیکن یہ میں ہی جانتا تھا کہ اس کی حیثیت باہر کی دنیا میں کیا ہے؟ اس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہونے لگتا تھا۔ اس شخص کی اس وقت صرف یہی خواہش تھی کہ میں میڈم کے سامنے اس کی صفائی اچھی طرح پیش کر دوں۔ مجھے علم ہو گیا تھا کہ ان سب کی حیثیت میڈم کے بغیر صفر ہے۔

تھوڑی دیر وہ میرے پاس بیٹھے رہے پھر مجھے ڈسٹرب نہ کرنے کی ایک دوسرے کو تلقین کر کے اٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے میری ''میزبان'' کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ یہ لوگ ''ضمانت'' کی مہم پر جا رہے تھے جس کے لیے ایسی لڑکیوں کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔

میں نے جرم و گناہ کی جس دنیا میں قدم رکھ دیئے تھے۔ وہاں احترام کے درجات اس دنیا جیسے نہیں تھے، جس کے آپ سب مکین ہیں۔ ہر پیشے کے اپنے ''کوڈ آف کنڈکٹ'' ہوتے ہیں۔

برصغیر میں بسنے والی ان قوموں کی روایتی کہانیاں بھی آپ تک پہنچی ہوں گی جن کے ہاں جب تک کوئی فرد ڈاکہ زنی کی باقاعدہ واردات کا مرتکب نہ ہو، اس سے کوئی لڑکی شادی نہیں کرتی۔ قتل نہ کرنے والے کو بزدلی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ طاقت کے علاوہ اور کسی اصول کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

یہ طاقت صرف زور بازو کی نہیں۔ دولت کی بھی ہوتی ہے۔

اس دنیا میں رہنے والی کالی بھیڑیں میڈم نادرہ یا ملک صاحب کی طرح شرافت کا سفید لبادہ کسی نہ کسی روپ میں ضرور اوڑھے رکھتی ہیں۔ یہ روپ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ کسی راہنما کا کسی رہبر کا۔ کسی خدا ترس بزنس مین کا کسی سرکاری یہ غیر سرکاری بڑے افسر کا۔

اس طرح کا نقاب اوڑھنا ان لوگوں کے لیے شاید اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ تنہائی میں انہیں خود اپنی اصل شکل سے خوف نہ آنے لگے۔

یہ لوگ اپنی زندگیوں کے اپنی شخصیات کے سامنے ایک سموک سکرین ضرور بنائے رکھتے ہیں۔ اس ''سموک سکرین'' کی آڑ میں نہ صرف خود کو خود سے پوشیدہ رکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو بھی دھوکے میں مبتلا رکھتے ہیں۔

یہ دھوکے کی دنیا ہے۔

مکر کا سودا ہے۔

فریب کی نگری ہے۔

یہاں ہر کوئی دوسرے کی ضرورت ہے۔ کمزوری ہے۔ جس طرح دولت میری ضرورت تھی۔ اسی طرح میں میڈم کی ضرورت تھا۔ مجھ ایسے کڑیل جسم کے دربان الف لیلیٰ کی قدیم داستانوں کے حبشی غلاموں کی طرح میڈم نادرہ جیسی عورتوں کے لیے بھی ناگزیر تھا۔ یہاں کا ہر مکین دوسرے مکین کے لیے ناگزیر تھا۔ لیکن اصل میں ہم سب اپنی ہی گھات لگا کر اپنا ہی شکار کھیل رہے تھے۔

.....☆☆☆.....

لڑکی لو مقامی ایجنٹ کے ساتھ ''ضمانت'' کروانے کی مہم پر روانہ ہوگئی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور کسی کو بتائے بغیر چپ چاپ باہر نکل آیا۔ میری جیب میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ میرا رخ مقامی بس سٹینڈ کی طرف تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک بس میں بیٹھ کر میں اپنے شہر کی طرف عازم سفر تھا۔ یہ بس شام تک مجھے اپنے شہر پہنچا دیتی۔ پھر اگلی صبح سے میری نئی زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔ نئی کومٹ منٹ کے ساتھ زندگی کے نئے سفر کی طرف گامزن ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے قدموں کی مضبوطی کا اندازہ تھا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جس طرح پرانے راستے پر میرے قدم ایک لمحے کے لیے بھی گامزن ہونے سے پہلے نہیں ڈگمگائے تھے اسی طرح میں نیکی کی اس مسافت پر بھی دل میں کوئی ملال کوئی خوف، کوئی وسوسہ، کوئی وہم لائے بغیر قدم بقدم آگے بڑھتا چلا جاؤں گا۔

اگر میڈم نادرہ کی دنیا میں رہتے ہوئے قانون، سماج اور سزا کے ضابطے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو یہاں میڈم نادرہ اور اس کے ساتھی بھی مجھے زک نہیں پہنچا سکیں گے۔ آخر میں امن کی راہ اپنانے جا رہا تھا۔ برائی سے تائب ہو رہا تھا۔ میں دوران سفر پیش آمدہ حالات کے متعلق منصوبہ بندی کرتا رہا اور نئے نئے منصوبے میرے ذہن میں ترتیب پا رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے رہوں گا۔ پھر میں آپ ہی آپ مطمئن ہو کر بیٹھ رہا۔ انسان بسا اوقات سب کچھ جاننے کے باوجود بھی احمقوں کی جنت میں رہنا کیوں پسند کرتا ہے؟

شاید اس سوال کا جواب وہ کبھی تلاش نہیں کر پایا، میں نے بھی اس لمحے عزم سفر تو باندھ لیا تھا، لیکن جزا و سزا کا فلسفہ تو مجھے یاد ہی نہ رہا یا پھر میں نے دیدہ دانستہ فراموش کر دیا۔ ایک نہایت ہی تلخ حقیقت جس کا مجھے وقت نے احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا شاید اب اپنی اہمیت منوانے پر تل گئی تھی۔

یہ جان لیوا حقیقت میری بہن تھی۔ میں نے یہ بھلا دیا تھا کہ میں ایک جوان بہن کا بھائی ہوں اور معاشرے میں کبھی کبھی یہ حقائق المیہ بھی بن جایا کرتے ہیں۔

.....☆☆☆.....

میری بہن نے بھی میری طرح بہت گھٹن کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہ زبردست فرسٹریشن کا شکار رہی تھی میں نے تو اپنی محرومیوں کا قرض دنیا سے کسی حد تک چکا لیا تھا جبکہ وہ میرے جیسی حوصلہ مند نہیں تھی۔ عورت تھی بے چاری۔

لیکن اس نے فرار کی ایک راہ ضرور ڈھونڈ لی تھی۔

مڈل کلاس گھرانوں کی بہت سی فریسٹریٹڈ لڑکیوں کی طرح اس نے بھی نوجوان لڑکیوں کے لیے خاص طور سے نکالے جانے والے رسالوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔

میں کوئی ماہر نفسیات تو تھا نہیں کہ اس نکتے کو بھی ذہن نشین رکھتا۔ میں نے یہی سمجھا کہ عام لڑکیوں کی طرح جو اس عمر میں ایسی قباحتوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اس نے بھی اپنے احساس کمتری سے فرار پانے کے لیے تصوراتی دنیا میں کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کر لی ہے جہاں اس کی محرومیاں تھوڑی دیر کے لیے سہی دم توڑنے لگی ہیں۔

اس نے کبھی ہمیں احساس ہی نہ ہونے دیا کہ معاملہ تو میری سوچ سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ شاید اس پگلی نے لمبے رومانٹک افسانوں والے ''روایتی شہزادے'' کی تلاش بھی شروع کر دی تھی کہانیوں کی شہزادی کی طرح اس کا تصوراتی شہزادہ مل گیا۔

لیکن وہ بے چاری اصل اور نقل کا فرق کہاں سمجھتی تھی۔ اس نے تو ماں کی گود سے آج تک مرد کا ایک ہی روپ دیکھا تھا۔

یہ میرے باپ کا بھیانک روپ تھا۔ اس نے ظالم مردوں کی اس دنیا میں ہمدردی کے دو بول بول کر بھولی بھالی معصوم بچیوں کو لوٹ لینے والے بردہ فروشوں کو بھی ''فرشتہ'' جان کر قبول کر لیا۔ شاید ایسا کوئی نوجوان ہی اس کا محبوب بن گیا تھا جو ایسے ''معصوم شکار'' کی تلاش میں بس سٹاپوں اور لڑکیوں کے کالجوں کے گرد ملیریا پھیلانے والے مچھروں کی طرح بھنبھناتے رہتے ہیں۔

میری بہن تو بدقسمت تھی ہی۔ لیکن وہ شاید دنیا کا بدقسمت ترین انسان ہوگا جس نے فرشتوں جیسی کومل میری بہن کی قدر نہ جانی۔

میں نے اس درندے کو پہلے روز اس وقت دیکھا جب ہماری بس شہر میں داخل ہو رہی تھی۔

.....☆☆☆.....

ٹریفک کے ایک سگنل پر جب بس رکی تو میں نے اپنی کھڑکی سے باہر سرسری نظر ڈالی اور میری نگاہیں ایک کار پر جم کر رہ گئیں۔ ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے کے ساتھ جس کا حلیہ دیکھ کر ہی اس پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا تھا۔ میری بہن محو سفر تھی۔ پہلے تو میں نے اسے اپنی بصارت کا دھوکہ جانا۔

یہ منظر ایسا نہیں تھا کہ میں صرف ایک نظر دیکھ کر اس پر ایمان لے آتا۔ لیکن یہ فریب نظر نہیں تھا۔ یہ بڑا کڑوا اور کسیلا سچ تھا۔ جس کا زہریلا ذائقہ ایک لمحے کے اندر میری رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ مجھے اپنے خون کا خمیر بدلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میرے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ میں دیوانوں کی طرح ٹکر ٹکر اس کار کو گھور رہا تھا جو اب ٹریفک کے سمندر میں تیرتی ہوئی میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ بالکل اس آگ اگلنے والے اژدھے کی طرح جو اپنے بل سے نکل کر بڑی آہستگی سے اپنے شکار کی طرف جھپٹتا ہے۔ پھر اپنی شعلہ اگلتی زبان سے بے بس شکار کو ڈس کر واپس اپنی راہ لیتا ہے۔

بس کی سیٹ پر کھڑکی کی جانب بیٹھے ہوئے مجھے شدت سے محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ میری مثال مصر کی حنوط شدہ ممیوں جیسی تھی جو چھو کر دیکھنے سے پہلے زندہ نظر آتی ہیں۔ مجھ میں گردن موڑ کر بس کے اندر کا ماحول دیکھنے کی ہمت بھی شاید باقی نہیں رہ گئی تھی۔

کسی ان دیکھی طاقت نے ہی میری گردن کو موڑا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اپنی ٹانگوں پر اب کبھی دوبارہ کھڑا ہو پاؤں گا۔

ٹریفک سگنل سے لاری اڈے تک کا سفر موت کا سفر بن چکا تھا۔ میں موت کی راہ کا مسافر لاری اڈہ آنے تک مر مر کے جیا اور جی جی کر مرا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کروں تو کیا کروں؟ جاؤں تو کدھر جاؤں؟ میرے سارے خواب بکھر گئے۔

میری شرافت کے تابوت پر اس منظر نے ایسی کیل ٹھونک دی کہ اب شاید ہی کوئی مجھے

اس میں سے زندہ برآمد کرتا۔ میری روحانی موت یقیناً واقع ہو چکی تھی۔

گھر پہنچنے کا عمل کیسے وقوع پذیر ہوا۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔

وہ میرے قدم ہرگز نہیں تھے جن پر چل کر میں ایک رکشہ تک پہنچا تھا۔ میرے نطق کو تو موت آ گئی تھی شاید میرے اندر موجود کسی پراسرار قوت نے رکشہ ڈرائیور کو میرے گھر کا راستہ بتایا تھا۔

رکشہ سے اتر کر جب میں گھر کے دروازے تک پہنچا تو میری حالت آپریشن ٹیبل سے اٹھ کر بھاگ جانے والے اس مریض جیسی تھی جس کا انستھیسیا کسی مقام پر کمزور پڑ گیا ہو۔ اچانک دوران آپریشن ہوش آ گیا ہو جو سرجن کو ہکا بکا چھوڑ کر کسی روح کی طرح اٹھ کر چل پڑے۔

ماں جب دروازے پر مجھے دیکھ کر مصلے سے اٹھ کر میری بلائیں لینے کے لیے آگے بڑھی تو میں نے ایک لمحے کے لیے اس کے مقدس چہرے کی طرف دیکھ کر ضرور سوچا تھا کہ اس کی زندگی بھر کی ریاضت غارت گئی حالات کی کالی دیوی کے حضور اپنی جوانی، اپنی پوری زندگی کی خوشیوں، آسائشوں کی بھینٹ چڑھانے کے بعد بھی میری ماں کی "بلی" ابھی منظوری کا درجہ نہیں پا سکی تھی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اسے کس ناکردہ جرم کی سزا مل رہی تھی۔ اس کی زندگی بھر کی ریاضتیں کہاں کھو کر رہ گئی تھیں۔

شاید اس کی دعائیں بارگاہ الٰہی تک پہنچ ہی نہیں پاتی تھیں۔ شاید قدرت کے نظام الاوقات سے اس کی زندگی کے نظام الاوقات لگاؤ ہی نہیں کھاتے تھے۔ کچھ بھی تھا۔ بہرحال یہ وقت کا لمبا تفاوت میری ماں کا المیہ بن گیا تھا۔ اس کی التجاؤں پر فرشتے صبر کا دائرہ لگا کر انہیں واپس لوٹا دیتے تھے۔ قدرت نے اس کے لیے زیادہ منافع اور لمبی مدت کا قانون لاگو کر دیا تھا۔

اس کی ہر دعا "ڈیپازٹ اکاؤنٹ" کو منتقل کر دی جاتی تھی۔ پانچ گنا منافع پانے کے لیے شاید قدرت نے اسے برگزیدہ ہستی بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وقت کے کرنٹ اکاؤنٹ سے اسے کبھی ایک دمڑی بھی وصول نہ ہوئی۔ اس ہاتھ دو، اس ہاتھ لو، کا فارمولا اس پر کبھی لاگو نہ ہوا۔

اس پر زندگی کی بھید بھری خوشیوں کے اسرار کبھی منکشف نہ ہوئے۔

عجب تھا نظام قدرت۔

عجب گورکھ دھندہ تھا یہ۔

میرے تپتے ماتھے پر اس نے اپنے ٹھنڈے اور بے جان ہونٹوں کا بوسہ حسب سابق دیا۔

حسب سابق اس نے میری جوانی، عمر اور اقبال مندی کی دعا دہرائی۔

ہزاروں مرتبہ سنی ہوئی رٹی رٹائی دعاؤں کی [illegible] اس لمحے تک بوچھاڑ جاری رہی جب تک میں اپنے کمرے میں نہیں پہنچ گیا۔

میں کمرے میں پہنچا اور وہ اپنا "پرائشچت" مکمل کرنے کے لیے دوبارہ مصلے پر براجمان ہو گئی۔ میں نے اپنے کمرے میں اپنے بستر پر [illegible] کر سوچا۔

یا اللہ زندگی کے بازار میں خوشیاں سمگلی ہو کر ہی کیوں آتی ہیں۔ ان کا بھاؤ اتنا تیز کیوں ہے کہ کوئی بھی خرید نہیں پاتا اور اگر کوئی خوشیوں کی [illegible] مارکیٹ تک پہنچ ہی جائے تو وہاں قناعت کا سائن بورڈ ہی کیوں نظر آتا ہے۔ زندگی کے کھٹے انگور بار بار کی اچھل کود کے بعد اگر منہ میں آ ہی جائیں تو انہیں میٹھے کیوں نہیں بنا دیتا۔ ان کی ترشی ختم کیوں نہیں ہو جاتی؟ لیکن مجھے ہمیشہ کی طرح اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔

.....☆☆☆.....

ماں اپنے وظائف مکمل کر کے میرے پاس آ گئی اس نے جب میرے جسم پر ایک دو خراشیں دیکھیں جنہیں میں نے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی تو مرغی کی طرح مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ ایک لمحے کو جب مجھے اس کے پھیلائے ہوئے پروں میں تحفظ کی گرمی میسر ہوئی تو میں سسک پڑا۔

کتنی عجیب ہے فطرت انسانی کہ دکھ انسان اکیلی جان پر جھیلتا رہے تو خوب، جہاں اسے پرسان حال ملا وہ رو پڑتا ہے۔ شاید میری بھی یہی کیفیت تھی درد میری آنکھوں کے راستے پگھل کر میری ماں کے سوتی کپڑوں میں جذب ہونے لگا۔ اس نے شاید مجھے زندگی میں اس طرح پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ کٹ کر رہ گئی۔ بے چاری۔

"بیٹے! تم بھی....."

اس کی ادھوری بات نے ہی مجھے دانا بنا دیا۔

مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ مجھے رونا نہیں چاہیے۔

اپنی مرضی سے رونے کا اختیار تو میں کبھی کا اپنی ماں کو سونپ چکا تھا۔ میں نے اپنا پتہ مار لیا۔ میں "خفتہ" آتش فشاں پہاڑ کی طرح وہیں جم کر رہ گیا جس نے اپنا بقیہ لاوا اگلی تباہ کاری کے لیے محفوظ کر لیا ہو۔

خدا کا شکر ہوا کہ میں نے لاوا تھوڑا اگلا تھا ورنہ تو نجانے ہماری بسی بسائی بستی ہی غرق ہو جاتی۔ ناوانستگی میں آج پہلی مرتبہ میں نے زندگی کے ساتھ ہونے والے اپنے سمجھوتے کی بھی شاید خلاف ورزی کر ڈالی تھی۔

اس سمجھوتے کی پہلی شرط ہی یہ تھی کہ میں اپنے روگ اپنے اندر پالوں گا۔ انہیں آشکارا نہیں ہونے دوں گا۔

ماں نے ایک دو مرتبہ مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن پھر چپ ہو رہی۔ بے چاری شاید ڈر رہی تھی کہ کماؤ پوت ناراض نہ ہو جائے۔ کتنی مظلوم ماں تھی میری ماں۔ پھر وہ اٹھ کر کسی بہانے سے باہر چلی گئی میں جانتا تھا اب وہ مجھ سے چھپ کر خوب روئے گی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میری بہن کی واپسی ہوئی۔ میری بہن اپنی کسی سہیلی کے مکان پر کسی میلاد کی محفل میں شرکت کا بہانہ کر کے گئی تھی۔

یہ بہانہ بھی انہی کتابوں کی دین تھا جو اس نے محلہ کی لائبریری سے منگوا کر مجھ سے چوری چوری پڑھ لی تھیں یا پھر اسی مجرم کی عنایت تھی جس نے اس معصوم کی پاکیزگی کا خون کر کے اسے اس درجے گھٹیا جھوٹ کا فن بھی سکھا دیا تھا۔ وہ کچھ ایسی ہی کیفیت کا شکار نظر آ رہی تھی۔ جس کیفیت سے عموماً ان حالات سے گزرنے والی لڑکیاں دوچار ہوتی ہیں۔

مجھے گھر میں لیٹے دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹک گئی کیونکہ اتنی جلدی تو میری واپسی کا امکان نہیں تھا۔ احساس جرم تھا یا پھر اس کا کچا پن کہ وہ خواہ مخواہ گھبرا گئی۔ پھر سنبھل کر اس نے میری

خیریت دریافت کی۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟"

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ نجانے میرے لہجے میں کون سے تہہ چھپا تھا کہ وہ سہم کر رہ گئی۔ شاید اسے میری سنجیدگی نے سنگینی حالات کا احساس دلایا تھا۔

"بھیا! میں..... میں....."

اس نے اپنے چہرے کی بدلتی رنگت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"شاباش۔ ایسے ہی کرتوت ہوتے ہیں شرفاء کے۔ باپ جیل میں ہے۔ ماں مریض۔ بھائی گھر سے باہر، اس سے اچھا موقع بھلا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔"

میں پھٹ پڑا۔ ضبط کا یارا اب رہا نہیں تھا۔ زندگی سے ہونے والے معاہدہ کی میں نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اپنی کمزور ترین پوزیشن کے باوجود سیز فائر لائن توڑ ڈالی۔ یہ جانے بغیر کہ معاہدہ توڑنے کی اس سنگین خلاف ورزی کے نتائج کتنے تباہ کن ہوں گے۔ دوسری طرف سے اتنا زوردار حملہ ہو گا جسے میں کسی صورت میں بھی کاؤنٹر نہیں کر سکوں گا۔

میرے منہ میں جو بات بھی آئی میں بکتا چلا گیا۔

وحشیوں کی طرح۔

پاگلوں کی طرح۔

بے چاری مجبور لڑکی رونے لگی میں نے اس کے آنسوؤں پر قطعاً دھیان نہیں دیا۔ میرا اسے مارنے کو بھی دل نہ چاہا۔ میں تو اس سے اب تک اپنے لیے سزا منتخب کروا رہا تھا۔ اس گناہ کا کفارہ مجھے ادا کرنا تھا۔ میرے اس وقت جذبات کچھ عجیب سے تھے۔ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔

"بھیا وہ....."

اس نے سنبھل کر کچھ کہنا چاہا۔ شاید عزت نفس پر میری طرف سے ہونے والے تابڑ توڑ حملوں نے اسے دلیر بنا دیا تھا۔ شاید بے چاری اپنے "سچے پیار" کی توہین برداشت نہ کر سکی تھی۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں وہ کون ہے؟"

غیظ وغضب سے پھنکارتے ہوئے میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں نے تو اس کے لیے ''صفائی'' کا کوئی راستہ ہی باقی نہیں چھوڑا تھا۔

اس بے چاری کی حالت تو نام نہاد عدالت کے روبرو کھڑے اس بے گناہ کی سی تھی جسے بظاہر تو صفائی کا حق دیا جاتا ہے لیکن خصوصی عدالت میں بولنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ جس کے خلاف فرد جرم پڑھ کر صرف اس لیے سنائی جاتی ہے کہ وہ اس پر صاد کرے۔

خواہ یہ سچ ہے یا جھوٹ، تاکہ اسے فوراً سزا دی جا سکے۔

میں نے شعلے اگلتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''اس سے کہو پرسوں تمہارے ساتھ شادی کر لے۔ ماں سے کسی بات کا ذکر نہ کرنا۔ وہ پہلے ہی بہت سکھی نہیں ہے۔''

میں جھٹکے سے دروازے کی سمت مڑا اور تیزی سے باہر کو لپکا۔

.....☆☆☆.....

میری بہن کو میرے دکھ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بے قراری سے میرا بازو تھامنے کے لیے آگے بڑھی، لیکن میں نے اسے دھکا دے کر چارپائی پر گرا دیا۔

بجلی کی سی تیزی سے وہ دوبارہ اٹھی اور مجھے پھر تھامنے کی کوشش کی۔ میں نے پھر اسے جھٹکے سے الگ کر دیا۔ اس نے اٹھ کر اپنا دوپٹہ میرے پاؤں میں پھینکا لیکن میں تو پتھر بن چکا تھا۔ میں نے اپنے راستے میں آنے والی اپنی معصوم بہن کے دوپٹے کی اس ''سد سکندری'' کو بھی روند ڈالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ماں شاید ساتھ والے گھر کسی کام سے گئی تھی اس بے چاری کو علم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی غیر موجودگی میں مجھ بدنصیب کے ہاتھوں اس کی بیٹی پر قیامت ٹوٹ گئی ہے۔

میرے بدن میں آگ دہک رہی تھی۔

میری زبان نے اپنی بہن پر کیا کیا شعلے نہیں اگل دیئے تھے لیکن یہ آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اتنا کروڈھ تو زندگی میں کبھی مجھ پر طاری نہیں ہوا تھا۔ میں جل جانا چاہتا تھا۔ سب کچھ جلا کر بھسم کر دینا چاہتا تھا۔ میں وہ راون بن گیا تھا جس کے ہاتھوں اس کی اپنی لنکا تباہ ہو جایا

کرتی ہے۔

مجھے بھارتی سرحد کے اندر موت کی گود میں بیٹھ کر بچوں کی طرح، بزدلوں کی طرح سسکیاں لیتے ہوئے خدا کے حضور گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگنے کی التجائیں اپنے وعدے تو بہ سب ہی کچھ تو بھول گیا تھا۔

کروڈھ کی سرخ آندھی نے سب کچھ راکھ کے ڈھیر کی طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

اپنی زندگی کو سراب اور شباب کی رنگینیوں میں غرق کر دینے کے باوجود ایک لمحے کے لیے اپنی بہن کو کسی غیر کے پہلو میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں اس کھیل کو ختم کر دینے پر تل گیا تھا۔

اپنی بہن کی کوئی بات سنے بغیر، اس لڑکے کو جانے بغیر، اس سے اپنی بہن کے تعلقات کی نوعیت جانے بغیر، میں اس پر اپنا فیصلہ نازل کر کے باہر نکل آیا تھا۔

میں نے اس بے چاری کو 24 گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ میں نے اس کو بتا دیا تھا کہ 24 گھنٹوں میں اس نے بہرصورت اپنی زندگی کا فیصلہ کرنا ہے۔ میں نے زندگی کو گڈی گڈے کا کھیل سمجھ لیا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ صبر نام کے کسی لفظ کا وجود بھی ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ وہ لڑکی جس کو مار ڈالنے میں کوئی کسر میں نے نہیں چھوڑی۔

وہ میری بہن ہے۔

وہ بہن جس نے میری ماں کی طرح اپنی زندگی کی کئی راتیں صرف اپنی سلامتی کی دعاؤں کے لیے جاگ کر گزاری ہیں۔ اگر کسی درندے نے اس معصوم ہرنی کو شکار کر لیا تھا تو اس میں ہرنی کا کوئی گناہ نہیں تھا۔ یہ تو قانون فطرت تھا۔ وہ کمزور لڑکی تھی۔ درندوں کے اس جنگل میں جہاں قدم قدم پر خونخوار بھیڑیے اس کے لیے دام پھیلائے بیٹھے تھے۔ اسے بہرحال شکار ہونا ہی تھا۔

.....☆☆☆.....

میں اسی وحشت کے عالم میں میڈم نادرہ کے ہاں پہنچ گیا..... جو بے چینی سے میری منتظر تھی۔ اسے میرے بچ نکلنے کی اطلاع مل چکی تھی۔

"اوہ میرے خدایا! کتنی پریشانی تھی مجھے..... خدا کا شکر ہے تم بچ گئے۔"

مجھے دیکھتے ہی وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی۔ جس حالت میں آج میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس حالت میں شائد اس گھر کے کسی نوکر نے بھی اسے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ گزشتہ دو راتوں سے جاگ رہی ہے۔ مسلسل سگریٹ نوشی اور جاگو مٹی سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اس کے ہمیشہ گلابی رہنے والے گالوں پر سپیدی رینگنے لگی تھی۔

اس کے بال ایسے ہو رہے تھے جیسے ماتم کرنے والوں کے اپنے سر میں راکھ ڈالنے کے بعد ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کی خواب گاہ میں بکھری ایک ایک شے، بستر پر پڑی سلوٹیں اس کی بے خوابی اور بے چینی کی منہ بولتی تصویریں تھیں۔ دروازے پر میرے استقبال کو آنے والی اس کی خاص ملازمہ نے مجھے بتایا تھا۔

"میڈم! دو روز سے اپنی خواب گاہ سے باہر نہیں نکلیں..... تمام مصروفیات انہوں نے ملتوی کر دی ہیں۔"

میری شکل پر نظر پڑتے ہی جس دیوانگی کا مظاہرہ اس نے کیا تھا۔ اس سے احساس ہوتا تھا کہ میرے واپس لوٹنے کی صورت میں میڈم نادرہ کی یہ خوبصورت خواب گاہ ہی اس کا تابوت بن جاتی۔

وہ کبھی اس تابوت سے زندہ باہر نہ آتی..... کیونکہ اب میں اس کے نزدیک صرف "کارندہ" ہی نہیں رہا تھا۔ جانے کی مجبوری تھی جس کے ہاتھوں اس نے مجھے اس مشن میں جھونکا تھا۔ اسے شاید یہی امید تھی کہ میں اب کبھی سرحد پار نہیں جاؤں گا۔

سرحد پار جانا ہمارے منصوبے میں شامل نہیں تھا..... مجھے "مس" کرنے والی مسز نادرہ کو شاید اس بات کا احساس ہی نہ ہو پایا کہ میں تو کبھی کا مر چکا ہوں۔ وہ تو کوئی اور شخص تھا جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ لیکن یہ مسز نادرہ کی بانہیں تھیں۔ میری ماں کی نہیں! میں ساکت رہا۔

پتھر کے بت کی طرح۔ میں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ مجھ سے لپٹی مسز نادرہ کی آنکھیں میری قمیض کا کالر بھگوتی رہیں۔ وہ اپنے ہر عمل سے اس پچھتاوے کا نوحہ الاپ رہی تھی جس کا وہ تب سے اب تک شکار رہی تھی۔

بچوں کی طرح میرے بازو کو بار بار جھنجھوڑ کر وہ مجھے اپنی حالت زار سے آگاہ کر رہی تھی۔ مجھے اس پر نہ تو رحم آ رہا تھا نہ ہی غصہ۔ میں تو وہاں تھا ہی نہیں۔ پچھتاوے کی جس آگ کا ایندھن حالات نے مجھے بنا دیا تھا اس کے سامنے مسز نادرہ کے غم کی حیثیت ہی کیا تھی۔

.....☆☆☆.....

اس نے میری دل لگی کے لیے فوراً اپنا روپ بدل ڈالا۔ خود کو بنا سنوار کر پرانے سانچے میں ڈھال لیا۔

میک اپ سے چہرے کی اذیت پر پردہ ڈال لیا لیکن اس رات میں نے کسی شیطانی کھیل میں حصہ نہیں لیا۔ وہ رات دیر گئے تک میری پریشانی کا سبب دریافت کرتی رہی۔ میں اسے کیا بتاتا۔

بالآخر وہ پھٹ پڑی۔

"میں مسز نادرہ ہی نہیں ایک سوشل ورکر بھی ہوں اور وہی میرے اندر کی اصل عورت ہے۔ مجھے آج اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں اپنی پہچان کیوں نہ کروائی ..... تم کیا

عقائد کی کہانی جن کی کوئی حقیت نہیں مگر جنہیں آج کی ترقی یافتہ عورت بھی اپنے وجود کا حصہ بنائے خود کو ان پر بھینٹ چڑھانے پر آمادہ نظر آتی ہے۔

محبت وہ آفاقی جذبہ ہے جو انسان کو بیک وقت دو متضاد کیفیات سے دوچار کر دیتا ہے۔ عین اس وقت کہ جب ایک طرف یہ اپنی دھیمی دھیمی سلگتی ہوئی آنچ سے پتھر دلوں کو موم کرتا ہے تو دوسری طرف کسی تند و تیز اور پر شور انداز میں بہنے والے سرکش دریا کی طرح اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کاٹتا چھانٹتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ محبت اور فطرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چہار سو بکھری فطرت اور اس کے دل ربا نظارے اس جذبے کو مہمیز دیتے ہیں اور انسان کو بے خود کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی ہی لافانی محبت کی داستان ہے جس کا آغاز پاکستان کے فردوس منظر شمالی علاقوں میں ہوا اور پھر یہ گنگناتے جھرنوں' فلک بوس کوہساروں' خوبصورت آبشاروں کی ہمراہی میں اونچی نیچی سنگلاخ راہوں پر اپنا سفر طے کرتی رہی۔

اس کہانی کا مرکزی کردار تیمور اور فرحین انہی حسین وادیوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور پھر ان کے دلوں میں دھیمی دھیمی محبت کی ایک ایسی جوت روشن ہوتی ہے جو بجھائے نہیں بجھتی۔ آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ محبت شعلہ جوالا بن جاتی ہے۔ ایک ایسا سرکش جذبہ جو کسی رتم تسم اور بندھن کو قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پامال کرتا ہے اور دریائے کنار کی طرح اپنے ساتھ سب کچھ بہاتا چلا جاتا ہے۔ اس کہانی کا موضوع بہت نازک ہے اور میں نے اس موضوع سے نبھانے کی اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔ اب یہ آپ دیکھیں کہ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔

طاہر جاوید مغل

فیصلہ

صبح کی سیر ہمیشہ سے میرا معمول رہا ہے۔ میں گھر سے باہر بھی ہوتا ہوں تو اس معمول میں فرق نہیں آتا۔ میں اپنے ایک دوست کے ہاں راولپنڈی میں قیام پذیر تھا۔ یہ عارضی قیام تھا یعنی صرف دو روزہ..... اس کے بعد مجھے شمالی علاقہ جات کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ تن تنہا اور بے سمت..... یہ تن تنہا یعنی "سولو ٹور" میں پہلی مرتبہ لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی بھی میں شمالی علاقہ جات کا رخ کرتا تھا' دوست اور ہم مزاج ساتھی میرے ہمراہ ہوتے تھے' کبھی یہ تعداد ایک ہندسے کی ہوتی تھی' کبھی دوہرے ہندسے کی اور ایک مرتبہ تو یہ تہرے ہندسے تک بھی پہنچی تھی۔ شمالی علاقہ جات سے میرا عشق کوئی نئی بات نہیں۔ یہ برسوں پرانا شوق تھا اور میرے ساتھ ہی جوان ہوا تھا۔ میں نے کالج کے زمانے میں ٹریکنگ اور ہائی کنگ شروع کی تھی۔ کالج کے ہائی کنگ کلب کا میں معروف ترین ممبر تھا۔ بعد ازاں یہ شوق آگے بڑھا اور میں نے کلائمبنگ (کوہ پیمائی) کی طرف بھی پیش قدمی کی۔ ایک معروف کلب کی ٹیم کے ساتھ میں نے کئی چھوٹی بڑی چوٹیاں سر کر رکھی تھیں۔

.....ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا راولپنڈی میں اپنے قیام کا اور صبح کی سیر کا..... یہ میرے بس میں ہی نہیں ہوتا کہ بادصبا کا لمس پانے کے باوجود میں بستر میں پڑا رہوں۔ اس روز بھی علی الصبح میں لیاقت باغ کی طرف نکل گیا۔ میں ایک ٹریک پر جاگنگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک دراز قد نوجوان سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو میں تھوڑا سا چونکا اور رک گیا۔ مجھے نوجوان کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' نوجوان کی رفتار سست ہو گئی تھی اور وہ بھی گھوم کر میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو دونوں رک گئے۔ میں نوجوان کی طرف بڑھا۔ گورے چٹے چہرے پر دائیں کان سے نیچے ایک مسا نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں

سمجھوتے کی خلاف ورزی پر حد لاگو کر دی گئی تھی۔ سیز فائر لائن توڑنے پر زندگی نے پوری قوت سے جوابی حملہ کر دیا تھا۔ مہلت تمام ہو گئی تھی۔

در توبہ بند ہو چکا تھا۔

میں نے دور ہی سے دیکھا ہمارے گھر کے باہر لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل پر زور سے گھونسا مار دیا ہو۔

یہ گھونسا وہ پہلا کاشن تھا جو مجھے موصول ہوا۔ ایک لمحے کے لیے بھی کسی مثبت سوچ نے مجھے حوصلہ نہ دیا۔

میری چھٹی حس نے فوراً پیش آمدہ قیامت کا اعلان کر دیا۔ کسی نادیدہ طاقت نے میرے کانوں میں زور سے صور اسرافیل پھونک کر مجھے ہستی کے ناقید ہو جانے کی منادی سنا دی.....! میں گھر کے باہر کھڑے لوگوں کے درمیان تیزی سے راستہ بناتا اندر داخل ہوا۔

صحن میں میری بہن کی لاش پڑی تھی۔ اسے تیز رفتار ٹرک نے کچل ڈالا تھا۔ اس کے کالے سیاہ بال جن میں سات سمندروں کے رنگ جھلملایا کرتے تھے۔ خون سے چپک ہو رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید کھلی آنکھوں سے وہ مجھے مر کر بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

اس سے فرق کیا پڑتا تھا۔ اب ان آنکھوں میں زندگی کی دھنک تو کبھی جھلمل نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ میرے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

جیسے میں نے اس کے لیے "صفائی" کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

اس نے میری دی ہوئی مہلت کو پورا ہی نہیں ہونے دیا تھا اور 24 گھنٹے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا.....!

اس راجپوت زادی نے اپنے پرکھوں کی آن پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ زندگی کے خاتمے کا بلیک وارنٹ میں نے اسے تھمایا تو اس نے ماتھے پر بل لائے بغیر اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی.....

وہ کمزور سی، معصوم سی، بزدل سی میری بہن اتنی بہادر نکلے گی میرے وہم و گمان میں بھی

کبھی یہ بات نہ آ سکی۔

ماں نے آہستہ آہستہ میری بہن کا سارا داج تیار کر لیا تھا، اس نے سرخ دوپٹہ جسم پر ڈال دیا تھا اور چارپائی کے ایک کونے سے ٹکی اس کو گھورے جا رہی تھی۔

میری آمد سے اس کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ اس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ صرف بے بسی سے اپنا دایاں ہاتھ اس کی لاش کی طرف اٹھا دیا جیسے اس کے مر جانے کی شکایت کر رہی ہو۔

.....☆☆☆.....

چھوٹا بھائی مجھ سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میرے اندر کا زہر باد پھٹ گیا۔ مجھے اپنے سانس گڑوے کیسلے معلوم ہو رہے تھے۔

میری حالت بارود کے ڈھیر پر کھڑے اس سپاہی سے مشابہ تھی جو کسی بھی لمحے اس کے ساتھ ہی پھٹ سکتا تھا لیکن اس ڈھیر میں صرف چنگاری سلگ رہی تھی، دھماکہ نہیں ہو رہا تھا بارود سلگنے سے اٹھنے والا گندھک ملا دھواں سارا میرے حلق اور ناک کے راستے میرے اندر سرایت کر گیا تھا۔

کسی نے زبردستی میرے منہ میں نیم کے پتے دے کر مجھے جگالی پر مجبور کر دیا تھا۔

یہ کڑواہٹ میرے خون میں شامل ہو کر بدن کے روئیں روئیں میں گردش کر رہی تھی۔

میں چیخ چیخ کر بین کرنا چاہتا تھا لیکن کر نہ سکا۔

میں اپنا نوحہ الاپنا چاہتا تھا لیکن میرے نطق کو موت آ گئی..... پھر جیسے قدرت نے میری حالت پر رحم کیا اور میرے اندر کا کڑوا کسیلا دھواں میری آنکھوں کے کھلے کواڑوں سے باہر نکلنے لگا۔ زندگی رمق رمق واپس لوٹنے لگی.....

کنکریٹ کی دیواریں توڑ کر آنسو میرے دامن پر گرنے لگے۔ جانے کب تک میں سسکیاں لیتا رہا۔ پھر میرے گمشدہ حواس واپس لوٹنے لگے۔ حکم نامہ جاری ہوا کہ مجھے تو نوحہ کناں ہونے کی اجازت ہی نہیں.....

بس جتنی خلاف ورزی ہو چکی، ہو چکی۔

میں نے سوچا اگر میں ہی رونے لگا تو ماں اور بھائی کو کون سنبھالے گا.....لیکن میں کس کو دلاسا دیتا۔ اپنی ماں کو؟ اپنے بھائی کو یا خود کو؟ میں اس وقت کائنات کا سب سے زیادہ مظلوم انسان تھا۔ مجھ پر اندر باہر دونوں طرف سے یلغار ہو رہی تھی۔

مجھے اپنی بہن سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی سمندر کو اپنے پرانے پانیوں سے ہوتی ہے۔ نجانے اس نے مجھے کس جرم کی ایسی بھیانک سزا دی تھی۔ نجانے اسے اس بات کی سمجھ کیوں نہ آئی کہ سمندر اپنے اندر گرنے والے پرانے پانیوں کو اس لیے کبھی نہیں دھتکار سکتا کہ وہ گدلے اور میلے کیوں ہو گئے ہیں؟ اس نے تو سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اس کا وجود تو انہی پانیوں کی مرہون منت ہے۔

وہ اکیلا تو صرف ریت کا سمندر ہے۔

.....☆☆☆.....

قریباً دو تین گھنٹے بعد میری ماں کی سکتہ کی کیفیت ختم ہوئی۔ وہاں موجود سب لوگ اس موت کو حادثہ قرار دے رہے تھے۔ لیکن یہ حادثہ نہیں تھا۔ خودکشی تھی.....!! قتل تھا۔

میری بہن مقتول تھی کوئی اس کا قاتل تھا۔ اب مجھے اس کو تلاش کرنا تھا تا کہ اپنی بہن کا قرض چکا سکوں۔ یہی ایک صورت تھی "پرائشچت" کی۔ یہی وہ عمل تھا جو مجھے اپنی معصوم بہن کے خاموش "شراپ" سے بچا سکتا تھا۔

جنازے کی روانگی پر میری ماں چارپائی کے ساتھ لٹک گئی۔ میں نے اس کی طاقت کا جو منظر آج دیکھا تھا وہ شاید زندگی بھر نہ دیکھ سکا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ وہ صدمے سے مر جائے گی..... لیکن اس نے تو سارے دکھ اپنے اندر اس طرح جذب کر لیے، جیسے بلاٹنگ پیپر سیاہی کو چوس جاتا ہے۔ اس نے آخر دم تک کوشش کر ڈالی کہ لوگ اس کی بیٹی اس نے نہ چھینیں۔

پر لاشیں کون رکھا کرتا ہے۔

دروازے کی چوکھٹ تک وہ دیوار بن بن کر جنازے کا راستہ روکتی رہی۔ میرے

چھوٹے بھائی نے بمشکل اسے قابو کر رکھا تھا۔

بالآخر ہم نے اس کی بیٹی اس سے چھین لی۔ اس نے زندگی میں ہمیشہ شکست کا سامنا ہی کیا تھا۔ پہلے کب جیتی تھی؟ جواب جیت جاتی۔

آج تک خاوند سے بے بس جانوروں کی طرح پٹنے کے بعد بھی کسی نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔

وہ روتے ہوئے بھی اس بات کا خصوصی اہتمام کرتی تھی کہ اس کی آہیں کسی کے کانوں تک نہ پہنچ پائیں۔

احتجاج کے فن سے وہ آشنا ہی نہیں تھی۔ وہ تو گھر میں چلتے ہوئے اپنے قدموں کی چاپ بھی پیدا نہیں ہونے دیا کرتی تھی۔

لیکن آج اس نے تمام سبق جیسے ایک دم بھلا دیئے تھے۔ آج وہ اس بے قراری سے تڑپی تھی جیسے ذبح ہونے والے جانور تڑپا کرتے ہیں۔

اس کی آہیں آج سینے کا پنجر توڑ کر باہر نکل آئی تھیں۔ اس کی گریہ وزاری نے سارے آنگن کو میدان کربلا بنا ڈالا تھا۔

.....☆☆☆.....

اپنی بہن کو لحد میں اتارتے وقت میں رویا نہیں تھا کیونکہ اس اثناء میں میں نے اپنے آپ سے ایک وعدہ لے لیا تھا۔ مجھے اس کے قاتل کو ڈھونڈ کر اس کا قرض چکانا تھا ورنہ میں کبھی زندہ نہ رہ سکتا۔

ابھی تک میری ماں بھی اسے "حادثہ" ہی سمجھ رہی تھی۔

واقعات کے مطابق گھر سے نزدیک ہی ایک سڑک عبور کرتے ہوئے وہ اچانک ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آ گئی تھی۔ پولیس نے ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کر لیا تھا.....لیکن میں جانتا تھا کہ اس بے چارے کا کوئی گناہ نہیں؟

ہم نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اپنی بہن کو دفنا کر اس کا سرخ دوپٹہ اس کی قبر پر رکھ دیا۔

سہاگ کے لیے تیار کردہ اس ڈوپٹے کا اور استعمال بھی اب کیا رہ گیا تھا۔ میرا بھائی مجھے حوصلہ دے رہا تھا اور میں اس کو۔

لیکن اندر سے ہم دونوں ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔

میں نے اس خبر کو اپنے والد سے پوشیدہ رکھا اور سختی سے اپنے تمام رشتہ داروں کو بھی ہدایت کر دی کہ وہ بدقسمت باپ کو اس حادثے کی خبر نہ دیں۔ دوران قید میرے والد جس ذہنی عذاب سے دوچار تھے، بیٹی کی اچانک موت کی خبر اس کے بعد شاید ہی برداشت کر پاتے۔

ایک روز یہ قیامت تو ان پر ٹوٹنی تھی لیکن ان کی قید ختم ہونے میں اب تھوڑا عرصہ باقی تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ خدانخواستہ ہم کوئی اور سانحہ دیکھیں۔ میری والدہ شاید اور کوئی روگ نہ پال سکتی۔

والدہ رات بہن کے کمرے میں گزارنے پر بضد تھیں لیکن میں نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا۔ میں نے چھوٹے بھائی کو والدہ کے ساتھ ہی رات گزارنے کی تلقین کی۔

وہ بھی اب بچہ نہیں رہا تھا۔ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے اور نبھانے کی اہمیت جان گیا تھا۔ رات کو نیند کسے آتی؟ پھر بھی والدہ نے کمرے کی بتی بجھا دی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح اندھیرے میں اطمینان سے رہ سکے گی۔

والدہ کے کمرے کی بتی بجھتے ہی میں دبے پاؤں بہن کے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے گرا کر لائٹ جلائی اور دیوانہ وار اس کے کپڑے، الماری، کتابوں کی تلاشی لیتا رہا۔ لیکن جس چیز کی مجھے تلاش تھی وہ کہیں نہ ملی۔

کہیں کسی کاپی میں کوئی مردانہ تحریر نظر آتی تھی لیکن لکھنے والے نے کمال ہوشیاری سے اپنا نام تک نہیں لکھا تھا۔

بہرحال مجھے امید تھی کہ میں اسے سمندر کی تہہ سے بھی نکال لاؤں گا۔

اب زندگی کا سوال اس کے اور کوئی مقصد ہی کب رہ گیا تھا۔

.....☆☆☆.....

مسز نادرہ کو میں نے دوسرے روز اطلاع دی تھی۔ اسے میرے دکھ کا احساس تھا وہ آئی اور

روایتی انداز میں میری ماں کو حوصلہ دیتی رہی۔ وہ مجھے تنہا چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

اسے علم تھا کہ میں اب کسی کے روکنے سے نہیں رکوں گا۔ وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی تھی۔ جانتی تھی پچھتاوے کی جس آگ میں میں جل رہا ہوں وہ میری بہن کے قاتل کے خون سے ہی ٹھنڈی پڑ سکتی ہے۔

تیسرے روز وہ پھر آ گئی۔

اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں خود کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔ اس طرح میری ماں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ بظاہر اس نے ماں کو درمیان میں لا کر میری کمزور نبض پر ہاتھ رکھ دیا تھا واقعی میں اپنی ماں کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا، سسک سسک کر جی بھی سکتا تھا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ میں اس سے کوئی وعدہ نہ کر سکا۔

مجھے بخوبی علم تھا کہ مسز نادرہ کے ذریعے میں اس خونی کو کتے کی موت مروا دیتا وہ میرے انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے سب کچھ کر گزرتی لیکن یہ مجھ پر ظلم ہوتا۔

میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا اور ساری زندگی اپنے ضمیر کے ہاتھوں پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہتا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ ماں؟ لیکن نہیں.....اب میرے بس میں کچھ نہیں رہا تھا۔

چوتھے روز ڈاکیا ایک رجسٹری میرے نام لایا۔ یہ میری بہن کا آخری خط میرے نام تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"بھیا! میں نے تمہارے حکم کے مطابق ماں کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ میں مروں گی بھی تو اس طرح کہ تم لوگ بدنام نہیں ہو گے۔ اسلم نے میرے ساتھ باقاعدہ نکاح کیا تھا جس کا ثبوت ہمراہ ہے۔

بھیا! شاید میرے مرنے کے بعد ہی تم یقین کر لو کہ میں دھوکے میں ماری گئی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی اپنے ماں باپ کو منا کر مجھے لے جائے گا لیکن کل رات مجھے علم ہوا کہ وہ جھوٹا تھا۔ جب تم چلے گئے تو میں اس کے پاس گئی تھی لیکن اس نے..... بھیا! اپنی بے گناہی کا ثبوت وہ نکاح نامہ بھی تمہیں بھیج رہی ہوں جس کی ایک کاپی میرے پاس محفوظ تھی مجھے علم ہے

اس نکاح نامے کے ذریعے تم اسے ڈھونڈ لو گے، اور پھر نجانے کیا کر گزرو۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ اگر تم میری پاک دامنی کے متعلق شک میں مبتلا ہو جاتے تو میری روح کو کبھی چین نہ آتا۔ مر کر بھی نہیں۔ بھیا! تم ہمارے سب کچھ ہو۔ خدا کے لیے ماں کو اور دکھ نہ دینا۔ اپنی بہن کو معاف کر دینا۔ اس راز کو سینے ہی میں چھپائے رکھنا۔"

تمہاری بدقسمت بہن

میری بہن کے خط نے جہاں مجھے ایک مرتبہ پھر رلا ڈالا وہاں میرے مشن کو آسان بھی کر دیا۔

مجھے یقین تھا میری بہن کی کوکھ سے جنم لینے والی میری بہن گمراہ نہیں ہو سکتی۔ ضرور وہ دھوکے کا شکار ہوئی ہے۔

یہ بات سچ نکلی۔ واقعی اس کے بدقسمت قاتل نے اسے گھیر کر مارا تھا۔ اعتماد کے ہتھیار سے مسلح ہو کر اس پر حملہ کیا تھا۔

جس طرح اس ظالم نے بے رحمی سے یہ قتل کیا تھا۔ اسی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ میں اسے بھاگنے کر نکل جانے کا موقع نہ دوں۔

میں اسے آسان موت نہیں مارنا چاہتا تھا۔

نکاح نامہ حسب توقع جعلی ثابت ہوا لیکن اس کا اندراج موجود تھا جس سے میں نے بالآخر تیسرے ہی روز اس کا پتہ لگا لیا۔

واقعی وہ بھیڑ کی کھال میں چھپا ہوا بھیڑیا ثابت ہوا۔

تین روز تک میں اس کے معمولات کا جائزہ لیتا رہا۔ میں خود اسی دنیا کا باشندہ تھا لیکن ایسی مکروہ زندگی کا تصور بھی محال تھا جو وہ گزار رہا تھا۔

میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص باقاعدہ بلیک میلر ہے اور یہ لوگ گروہ کی شکل میں کام کرتے ہیں معصوم لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھانسنا پھر ان کو انہیں کے لکھے خطوط اور تصاویر کی مدد سے بلیک میل کرنا ان کا دھندہ تھا۔ خدا جانے کتنی معصوم لڑکیاں میری بہن کی طرح ان

بھیڑیوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں.....

شاید قدرت نے اس موذی کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے مجھے منتخب کر لیا تھا۔

اس اثناء میں گھر پر کیا قیامت ٹوٹتی رہی مجھے اس کا علم نہیں۔ میری ماں کو شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ اگر اس نے حوصلہ ہار دیا تو ہم زیادہ شدت سے دکھ محسوس کریں گے۔ وہ اندر ہی اندر رگ پالتی رہی۔ چھوٹے بھائی نے بھی اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی اور میری غیر موجودگی میں گھر کا پوری طرح خیال رکھنے لگا تھا۔

میڈم نے اس دوران مجھ سے ہر طرح رابطہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس خدشے کے پیش نظر کہ بطور احتیاط وہ میری نگرانی ہی نہ شروع کروا دے۔ اس سے ملتا رہا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے مجھ پر معمولی سا شک بھی ہو۔ اس طرح وہ میری نگرانی کرواتی اور جیسے ہی مطلوبہ شخص کا علم ہوتا اسے فوراً مروا دیتی تاکہ میں اس گناہ سے بچ جاؤں۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب دوبارہ میں مڑ کر بھی پرانی زندگی کی طرف دیکھوں۔ اس کی بہت بھاری قیمت میں نے ادا کروی تھی۔

.....☆☆☆.....

میں اس عمارت سے باہر آ گیا۔ عمارت کے دروازے پر پولیس میری منتظر تھی۔

.....☆☆☆.....

جب میں پولیس کے ہمراہ تھانے کی طرف جا رہا تھا تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی ایک جھلک دیکھی، تب مجھ پر اس کی پراسرار سرگرمیوں کا راز کھلا۔

وقت اور تجربات نے اسے خاصا سیانا بنا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے آنکھ بھی نہیں ملائی اور غالباً سب سے پہلے اس نے مسز نادرہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی تھی کیونکہ میرے تھانے پہنچنے سے پہلے وہاں شہر کے چوٹی کے وکیل میرے استقبال کے لیے موجود تھے اور پولیس کی مٹھی بھی خاصی گرم ہو چکی تھی۔

میرا بھائی مجھ سے تھانے میں بغلگیر ہو گیا اس نے بڑے شکایتی انداز میں کہا۔

"بھیا! تم ہر مرتبہ مجھ سے بازی لے جاتے ہو۔ آخر بڑے ہو نا!"

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اب وہی میری آخری امید تھی۔ اس کے معصوم کندھوں پر سارا بوجھ آن پڑا تھا۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے یہ بوجھ قبول کیا۔ مجھے مطمئن رہنے کی تلقین کی اور یقین دلایا کہ والد اور والدہ دونوں کو کبھی میری کمی کا احساس نہیں ہونے دے گا۔

مسز نادرہ نے گو کہ میرے اس فعل پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا لیکن مجھے اپنے نمائندے کے توسط سے یقین دلا دیا تھا کہ میرا بال بھی بیکا نہیں ہوگا اور میرے گھر کا وہ ہر طرح خیال رکھے گی۔

وہ خود مجھ سے ملنے نہیں آ سکتی تھی۔ مجھے اس حقیقت کا علم تھا۔

آخر وہ ایک معزز خاتون تھی۔

پولیس نے روایتی پرچہ درج کیا۔ میرا ہفتے کا ریمانڈ بھی لیا گیا۔ ایک ہفتے بعد مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ عدالت میں چالان پیش ہونے سے پہلے میرے ہوشیار وکلاء نے اس لڑکی کے ورثاء سے رابطہ قائم کر لیا جو موقع کی واحد گواہ تھی۔

آلہ قتل برآمد نہیں ہو سکا تھا۔

دفتر کے عملے میں سے کوئی موقع کا گواہ نہیں تھا۔ اس اثناء میں میرے بھائی اور مسز

نادرہ نے میری والدہ کو اس واقعہ کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اسے یہی بتایا گیا کہ میں ضروری کام سے دوسرے شہر جا رہا ہوں۔

میں نے پولیس اسٹیشن پر تمام وقت اس طرح گزارا جیسے اپنے گھر میں گزارا جاتا ہے۔ اب تو پولیس کو بھی مجھ سے ہمدردی ہونے لگی تھی، کیونکہ مقتول کے متعلق خاصے انکشافات ہو رہے تھے اور اس کے دفتر کی تلاشی لینے پر کئی قابل اعتراض تصاویر بھی برآمد ہوئی تھیں جن کی وجہ سے اب تک تین لڑکیاں موت کی آغوش میں پناہ لے چکی تھیں۔

اس طرح ان کی موت کا پراسرار معمہ بھی حل ہو گیا۔

پندرہویں دن میری ضمانت ہو گئی۔ بہن کی موت کی خبر آخر کب تک چھپائی جا سکتی تھی۔ ہم نے اپنے والد کو میڈیکل سرٹیفکیٹ کے ذریعے ہسپتال منتقل کروایا اور بالآخر سینے پر پتھر رکھ کر میں نے انہیں اس حادثہ جانکاہ سے آگاہ کر دیا۔ لیکن نہ تو اس کی خودکشی کی اطلاع دی اور نہ ہی اپنے قتل کے متعلق بتایا۔

میرے والد پر اس وقت جو قیامت ٹوٹی اس کا اندازہ شاید کوئی بھی نہ لگا پائے۔ بس وہ ایک ہی بات کہے جا رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے گناہوں کی سزا دے رہا ہے ہم اپنے اثر و رسوخ سے اپنے والد کو بہن کی قبر پر لے گئے وہ قبر سے لپٹے جانے کب تک روتے رہے۔

لیکن بہادر آدمی تھے اٹھے اور ہم دونوں بھائیوں کو سینے سے لگا کر حوصلہ دیا۔ پھر ثابت قدمی سے واپس جیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

.....☆☆☆.....

زندگی نے نیا پانسہ بدلا۔

میرا مقدمہ چلا اور تین ماہ تک زبردست بحث و مباحثہ کے بعد مجھے عدالت نے دو سال قید کا حکم سنا دیا۔ جس روز میں جیل جا رہا تھا اس روز میرے والد رہا ہو کر گھر آ رہے تھے۔ غالباً میرے چھوٹے بھائی سے رہا نہ گیا اور اس نے میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود والد کو تمام واقعات بتا دیئے۔

اگلے روز وہ مجھ سے جیل میں ملنے آئے تو میں خاصی شرمندگی محسوس کر رہا تھا لیکن انہوں نے مجھے حوصلہ دیا میرے عزم کو سراہا اور بہادروں کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔

میرا باپ بہادر آدمی تھا۔ مجھے حالات نے بہادر بنا دیا تھا لیکن میری ماں صرف ماں تھی وہ ہمارے عہد میں شامل نہ ہو سکی۔

اس کا "لائف پیکٹ" ختم ہونے والا تھا۔ جانے میری قید کا ایک سال وہ کیسے زندہ رہی ایک روز زندگی سے لڑتے لڑتے اس نے بالآخر چپ چاپ اپنی شکست تسلیم کر لی موت سے تین چار روز پہلے وہ جیل میں میری ملاقات کو آئی تو گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی رہی۔

اس روز نجانے کیوں اسے رہ رہ کر اپنی بیٹی یاد آ رہی تھی۔ رخصت ہونے پر اس نے مجھ سے کہا!

"بیٹے! میں اپنی بیٹی کی طرح بہادر عورت نہیں ہوں۔ شاید میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ساری خوشیاں ایک ساتھ مجھے نہ ملیں۔ شاید میں اس طرح خوشیوں کی شدت برداشت نہ کر پاؤں لیکن بیٹا! اب میں کوئی اور امتحان نہیں دے سکتی۔ میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں۔ مجھے یقین تھا زندگی میں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی لیکن شاید میری بندگی میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔"

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

جیل کی گنتی بند ہو چکی تھی جب وہ واپس لوٹی۔

دم رخصت اس نے متعدد مرتبہ میرا منہ چوما۔ بے شمار دعائیں مجھے دیں اور ہمیشہ کیلئے چلی گئی۔

ہماری ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

چوتھے روز دل کے دورے نے اس کی جان لے لی مرتے مرتے بھی اس نے کسی کو تکلیف نہ دی ہسپتال جانے تک کا تکلف نہ کیا۔

بستر پر ہی جان دے دی۔

.....☆☆☆.....

مسز نادرہ نے مجھے خاص اجازت نامے کے ذریعے ماں کی لاش دیکھنے کی مہلت دلا دی تھی میں ہتھکڑیوں میں بندھا اس کے سرہانے بیٹھا رہا جس طرح وہ ایک روز اپنی بیٹی کے سرہانے بیٹھ گئی تھی۔

میں نے اس کے جاگتے چہرے سے کچھ نہ پوچھا اس کی سوئی آنکھوں نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا دراصل ہمارے درمیان باتوں کا وہ منبع سوکھ چکا تھا جو حیوان ناطق کیلئے آب حیات ہے۔

میرا وجود خشک ریت کی طرح مٹھی سے نکل کر گرتا جا رہا تھا۔ والد صبر و رضا کا مجسمہ بنے میرے پاس بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی بے چین ہو کر وہ مجھے سینے سے لگا لیتے۔

مسز نادرہ مجھے حوصلہ دیتی رہیں۔ اس نے مجھے کہا کہ میری مردانگی کا صحیح امتحان اب شروع ہوا ہے۔

قانون کو اس بات سے کیا مطلب کہ میری ماں مر گئی ہے یا میرا باپ؟ وہ لوگ جلد ہی مجھے واپس لے آئے۔

ایک روز وہ خبر بھی مل گئی جس کے نہ ملنے کا مجھے ہمیشہ یقین رہا "مسز نادرہ سوشل ورکر ایک فضائی حادثہ میں ماری گئی۔"

میں نے یہ خبر جیل میں اخبار میں پڑھی لیکن اب میں اس قدر رو چکا تھا کہ میرے پاس اسے بھینٹ کرنے کے لیے کوئی آنسو باقی نہیں رہا تھا میرا دل ضرور خون کے آنسو روتا رہا۔

میں نے اندر ہی اندر نجانے کب تک اس کا ماتم کیا مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرتا نہیں لیکن ان کے بغیر جیا بھی نہیں جاتا یوں جینے کو تو لوگ جیتے ہی ہیں لیکن اسے آپ زندگی سے انسان کا سمجھوتہ ہی کہہ سکتے ہیں۔

جب تک میڈم نادرہ زندہ رہی کسی نہ کسی صورت میں ایک سموک سکرین میرے سامنے موجود رہی۔ سنتے ہیں کہ گھیرے میں آنے والی فوج دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے اس کے اور اپنے درمیان دھویں کی دیوار بنا دیا کرتی ہے شاید میڈم نادرہ ہی وہ سموک سکرین تھی جو میرے

اور حالات کے درمیان دیوار چین بنی رہی اب یہ دیوار پھٹ گئی ہے۔

مطلع صاف ہے۔اب میں دھوکے کی چال نہیں چل سکتا۔

کل میں رہا ہو جاؤں گا مجھے لینے کے لیے میرا باپ اور بھائی ضرور آئیں گے کچھ دوست بھی آئیں گے کیونکہ بیگم نادرہ نے ہمیں دولت مند بنا دیا ہے۔لیکن گھر پر میری راہ کون دیکھے گا؟!! مجھ اندھے، لولے، لنگڑے کو راستہ کون دکھائے گا۔ میں اپنے ساتھ کیا ٹومٹ منٹ کروں۔ کیسے کروں شاید ماں کی دعاؤں کا ڈیپازٹ اکاؤنٹ بھی بند ہو چکا ہے یا پھر ابھی ان کے ''ڈرا'' ہونے کا لمحہ بہت دور ہے۔ میرے لیے تو زندگی شام غریباں بن کر رہ گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے جب میں جیل سے باہر نکلوں گا تو زندگی بھر دستانے پہن کر مجھ سے ہاتھ ملانے آئے گی اور المیہ یہ ہے کہ اب میرا جبڑا بہت نازک ہو چکا ہے!اب تو مجھ میں کاغذی شیر جیسی دلیری بھی باقی نہیں رہی۔

میں اب بالکل تہی دست ہوں۔ زخمی خرگوش کی طرح بھاگ رہا ہوں اور شکاری کتے میرا تعاقب کر رہے ہیں لیکن یہ فرار، یہ دوڑ، یہ جدوجہد رائیگاں جاتی نظر آ رہی ہے۔ میں کتنا بھاگوں گا۔ کب تک بھاگوں گا۔ شعلے برساتی آنکھوں والے کتے نجانے کب آلیں!!

کب آلیں!

طارق اسمٰعیل ساگر

لاہور

چلے آئے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو کوئی رونق نظر نہیں آتی۔"

"کیا مطلب؟"

"بس ایسے ہنگاموں میں اب دل نہیں لگتا۔"

"کیوں؟"

"اس کا تو مجھے خود بھی علم نہیں..... بائی دی وے' آپ کو بھی تو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں..... ایسی بات تو نہیں۔ بس نماز کا وقت تھا اس لئے اوپر آگئی۔" چند لمحے خاموشی رہی پھر انہوں نے پوچھا۔ "نوّر کے دوران میں تو آپ ایسے ہلے گلے میں بہت خوش رہتے تھے۔"

"بس..... میں خود کو کچھ بدلا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔"

"اگر یہ مثبت تبدیلی ہے تو بہت اچھی بات ہے۔"

"اس تبدیلی میں دو مثبت باتیں ہیں۔ ایک تو یہ مثبت تبدیلی ہے' دوسرے آپ کی وجہ سے آئی ہے۔" میں نے بے باکی سے کہا۔

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں۔ سچی کھری بات تو یہ ہے کہ جو کام میری والدہ سے بھی نہ ہوسکا' وہ آپ نے کر دکھایا ہے۔ میں کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی برائیاں تھیں لیکن اب میں ہر روز خود کو پہلے سے کچھ بدلا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

ان کے چہرے پر عجیب سی چمک نظر آئی۔ اس میں خوشی کی جھلک تھی اور اس فخر کا احساس بھی کہ ان کی ذات کے حوالے سے کسی کے لئے بہتری کی کوئی صورت نکلی ہے۔

"میں آپ کو چند کتابیں بھجواؤں گی..... وہ پڑھئے گا۔" جیسے ایک دم ان کے منہ سے نکل گیا۔

"ضرور بھجوائیے گا' میں انتظار کروں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

خوش گوار ہوا کے شریر جھونکے ان کی اوڑھنی سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ انہوں نے اوڑھنی کو مضبوطی سے ٹھوڑی کے نیچے تھاما اور مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے نیچے چلی

گئیں۔

تین چار دن بعد مجھے گھر کے پتے پر ایک پارسل موصول ہوا۔ اس میں چند کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کے موضوعات فلسفہ اور انسانی نفسیات تھے۔ دو کتابیں خالص اسلامی نوعیت کی تھیں۔ میں نے ان کتابوں کو جستہ جستہ پڑھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کتابوں سے بھی زیادہ تحریک مجھے فرحین کی ذات سے مل رہی تھی۔ میں واقعتاً خود میں تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا اور میرے دل کی گہرائی میں تبدیلی کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔

چند روز بعد فرحین کا فون ملا۔ انہوں نے مجھ سے کتابوں کے بارے میں پوچھا۔ یہ جان کر ان کے لہجے میں خوشی کی جھلک محسوس ہوئی کہ میں نے کتابوں میں دلچسپی لی ہے۔ وہ مجھ سے ناصحانہ لہجے میں باتیں کرتی رہیں تاہم الفاظ کا انتخاب ایسا تھا کہ نصیحت کا بھاری پن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں قائل ہوگیا کہ وہ گفتگو کرنا جانتی ہیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے اخلاق کا ذکر بھی کیا' کہنے لگیں۔ "وہ آپ کا دوست ہے۔ آپ کی بات مانتا بھی ہے۔ اسے تھوڑا بہت سمجھاتے رہا کریں۔ دنیا کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ دھیان تو دین کی طرف بھی ہونا چاہئے۔ اخلاق کے مشورے سے نرگس نے بال کٹوالئے ہیں۔ کبھی کبھی پتلون بھی پہن لیتی ہے۔ رات گئے تک وی سی آر پر فلمیں دیکھتے ہیں۔ دوپہر گیارہ بجے بھی ان کے گھر پہنچو تو سوئے ہوئے ملتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "شادی کے بعد وہ صرف ایک دوبار مجھ سے ملا ہے۔ اب جب بھی ملے گا اس سے بات کروں گا۔"

آٹھ دس منٹ کی گفتگو کے بعد فرحین نے خدا حافظ کہہ دیا۔ میں ان کی گفتگو پر غور کرنے لگا۔ بڑا نفسیاتی انداز تھا ان کا..... وہ مجھے اخلاق کو سمجھانے کا کہہ رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کسی دوسرے کو سمجھاتا ہے تو وہ اپنے آپ پر بھی غور کرتا ہے کہ کہیں وہ خامیاں اس کے اپنے اندر بھی تو نہیں ہیں۔ یوں بالواسطہ اس کی اپنی اصلاح بھی ہوتی ہے۔

☆------☆------☆

اس کے بعد کبھی کبھار فرحین کا فون آنے لگا۔ ان کی آواز میرے دل کے ویرانے کی قسمت جگا دیتی۔ بنجر کان جیسے سیراب ہونے لگتے۔ میں بہت کم بولتا' یوں انہیں زیادہ